اندازِ سُخن اور

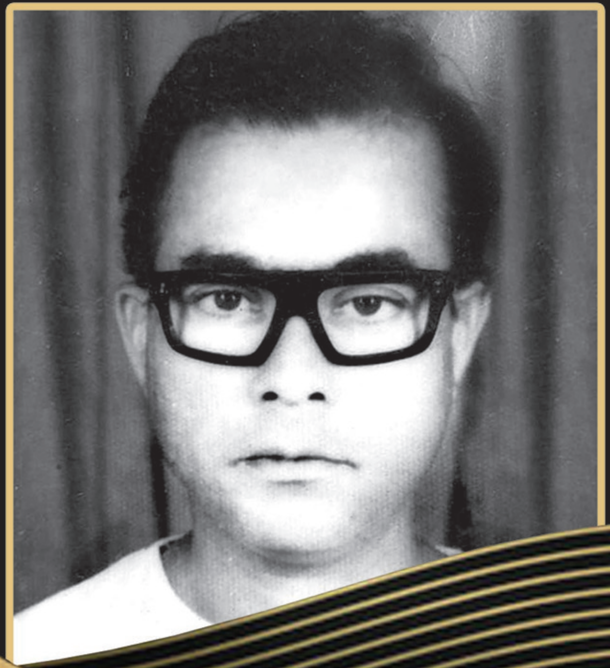

کلیاتِ شاہد رضوی

مرتّب: رعنا رضوی

اندازِ سخن اور
کلیاتِ شاہد رضوی
مرتّب: رعنا رضوی

۱۱ ستمبر ۸۹ء

شہرِ داغِ زرگل
شہرِ صبا آوارہ
آج گیسوئے غم یار سے کیا ٹھیری ہے
ہجر سے ساعتِ دیدار سے کیا ٹھیری ہے
درد کی اجنبی یلغار سے کیا ٹھیری ہے
کوئے قاتل میں فروزاں ہیں شہیدوں کے علم
رنگ گل، رنگ حنا، رنگِ لہو کے پرچم
کوئے دِلدار بھی ہے مجمعِ عشاق بھی ہے
ہم پہ کیا گزرے گی اغیار پہ کیا گزرے گی
کس کے سر جائے گی بازیِ وفا آج کے دن
نشہ عشقِ جنوں کار پہ کیا گزرے گی
پھر وہ محشر ہے کہ ہاتھوں میں لئے فردِ عمل
جمع ہے مجمع آشفتہ سراں
پھر یہاں ہوتا ہے تقسیم حسابِ غمِ جاں
عارض ولب کے مہکتے ہوئے خوش رنگ گلاب
داغ ہجراں کو صدا دیتے ہیں

کنج آغوش طرب کے حلقے
رنج افسردگی جاں کا صلہ دیتے ہیں
اب نہ ہوگا کہ وضع بند قبا کے نیچے
دل صد چاک سے نادیدہ لہو رستا ہو
اب نہ ہوگا کہ مرے دامن شب کے آنسو
جذب ہو نہ سکیں پلکوں پہ دکھائی بھی نہ دیں
اے مرے شہر جفا جو وطلبگار وفا
غم امروز و جمال فردا
آج اس مجمع عشاق سے کیا ٹھیری ہے
اور حساب غم بیباق سے کیا ٹھیری ہے

اندازِ سخن اور

کلیاتِ شاہد رضوی

مرتب

رعنا رضوی

جملہ حقوق بحق شاعر اور شاعر کی فیملی کے محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ شاعر کے نام کے بغیر یا ناشر یا شاعر کی فیملی کی اجازت کے بغیر کسی بھی وضع یا جلد میں کلّی یا جزوی منتخب یا مکرر اشاعت یا بصورت فوٹو کاپی' ریکارڈنگ' الیکٹرانک' یا ویب سائٹ اپ لوڈنگ کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔

آئی ایس بی این نمبر 978-969-23997-3-9

کتاب: اندازِ سخن اور کلیاتِ شاہد رضوی

مرتب: رعنا رضوی

کمپوزنگ: الحمد گرافکس' کراچی

سرورق: خالد مرزا

تعداد: 1000

سالِ اشاعت: 2024

قیمت: 600 روپیہ

رابطہ: ای میل

1shahidrizvi72@gmail.com

ناشر

مکتبۂ رضوی

گلشن اقبال' کراچی

انتساب

اُن آنکھوں کے نام جن میں
ایک نئی سحر کے خواب ہیں

فہرست

☆...... پیش لفظ	رعنا رضوی	۷
☆...... پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ	امام علی نازش	۹
☆...... حیراں کدے کی شاعری	وارث رضا	۱۵
☆...... طبقاتی شعور کا نمائندہ شاعر	شبیر آزاد	۲۳
☆...... زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے	رعنا رضوی	۳۱
☆...... شہرِ وفا		۳۵
☆...... قبائے جنوں		۱۹۹
☆...... دشتِ حیراں		۴۲۵
☆...... قطعات		۶۴۱
☆...... متفرقات		۶۴۶
☆...... کشتِ زعفران		۶۶۰
☆...... شاعر بقلمِ خود		۶۷۳

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اِس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

غالبؔ

یہی شرطِ عاشقی ہے ہو عزیز تر وہ بازی
جسے ہار کر بھی جیتے، جسے جیت کر بھی ہارے

شاہد رضوی

پیش لفظ

’’میں انسان کی تخلیق کے سائنسی نظریہ کا قائل ہوں انسان کو تاریخ کی حرکی قوت اور کائنات کی ایسی طاقت سمجھتا ہوں جس کے آگے کائنات اپنے سارے راز کھول رہی ہے۔ کائنات مسلسل رواں ہے اور نئے نئے روپ اختیار کرتی جارہی ہے اور انسان اس سے صرف چند قدم پیچھے، آگے بڑھ رہا ہے انسان اور کائنات کے تعلق کا یہ نظریہ میری فکر کی بنیاد ہے۔ کائنات کے حسن سے انسان کا رشتہ ناقابلِ شکست ہے۔ انسان نے کائنات کو حسین تر بنا دیا ہے اس عمل میں انسان نے خود کو بھی حسین تر بنالیا ہے زندگی جو فطرت کے قوانین کے تحت پیدا ہوئی انسانی عمل سے مستحکم ہوتی جارہی ہے تمام انسانی جذبے کسی نہ کسی طرح قوت تخلیق کے مظاہر ہیں۔

میرا نظریہ شعر یہ ہے کہ شعر انسان کے تہذیبی جذبوں کو سنوارنے، کائنات اور انسان کے درمیان شعور کی رو گہرا کرنے، انسان کو انسان سے متعارف کرانے۔ تزئین حسن اور شعورِ حسن عام کرنے کا ذریعہ ہے‘‘۔

یہ اقتباس شاہد رضوی کے شعری مجموعہ ’’شہرِ وفا‘‘ سے لیا گیا ہے جس کا تعارف انہوں نے خود تحریر کیا تھا اور اپنی سوچ، نظریہ اور فکر کے بارے میں گفتگو کی تھی۔

شاعر، شاہد رضوی کے نام سے معروف تھے ان کا پورا نام سید شاہد مسیح رضوی تھا، ان کے والد کا نام سید عابد مسیح رضوی المشہدی تھا (ان کے نام میں المشہدی کا لاحقہ اس لئے تھا کہ ’’مسیح‘‘ کا خطاب ان کے آبا و اجداد میں سے کسی کو مشہد میں طبابت کے سلسلے میں ملا تھا)۔ شاہد رضوی 31 دسمبر 1933 ء کو ہندوستان کے شہر لکھنو میں پیدا ہوئے تقسیم

ہندوستان کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان منتقل ہوگئے تھے اور کراچی سے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔

31 اگست 1997 ء کو جب دل کے ایک جان لیوا دورہ کے باعث ان کا اچانک انتقال ہوا اس وقت ان کے دو شعری مجموعے طباعت کے مراحل میں تھے 1998 ء میں دونوں شعری مجموعے ’’شہرِ وفا‘‘ اور ’’دشتِ حیراں‘‘ شائع ہوئے اور ایک طویل عرصہ کے بعد ’’کلیاتِ شاہد رضوی‘‘ جس میں ’شہرِ وفا، دشتِ حیراں‘ کے علاوہ ان کا غیر مطبوعہ کلام ’قبائے جنوں‘ کے نام سے شامل ہے‘ شائع کیا جارہا ہے۔

نوجوانی سے وہ بائیں بازو کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ان کی شاعری ہر ظلم کے خلاف چاہے وہ ترنم عزیز کا واقعہ ہو یا بیروت ہو یا فیروز سلطان ملز میں مزدوروں پر فائرنگ ہو، ملک میں مارشل لاء ہو یا‘ ایم آر ڈی کی تحریک ہو۔ دنیا میں کہیں بھی ظلم ہو ان کی شاعری ہر زیادتی اور ظلم کے خلاف ایک توانا آواز ہے۔ ان کے انتقال کے 27 سالوں کے بعد بھی ان کی شاعری آج بھی ظلم کے خلاف بھرپور توانائی اور جرأت کے ساتھ آواز بلند کرتی نظر آتی ہے ان کی شاعری ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے مثلاً 7 جون بہتّر کو لکھی جانے والی نظم کا پس منظر فیروز سلطان ملز کے مزدوروں پر ہونے والی فائرنگ ہے جو تنخواہوں میں اضافے کا مطالبہ کررہے تھے۔

ان کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر شخص کو کہیں نہ کہیں اپنا عکس نظر آتا ہے۔ ہر مظلوم کو اپنا درد پوری شدت سے دکھائی دیتا ہے۔ امید ہے کہ ہم ان کی کتاب ’’اندازِ سخن اور‘‘ کلیاتِ شاہد رضوی کے ذریعے ان کے کلام کو عوام تک پہنچانے میں کامیاب ہوں گے۔

رعنا رضوی

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

اوجھا سینی ٹوریم کی تنہائی میں جہاں میں گزشتہ ڈھائی سال سے زندگی اور موت کی کشمکش میں ہوں کامریڈ شاہد سے بچھڑنے کی قطعی غیر متوقع اور اندوہناک خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ شاہد جیسا وفادار کامریڈ اس طرح بغیر ملے' بغیر بتائے رخصت ہوجائے گا اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے

کیوں گئے تنہا اب رہو تنہا کوئی دن اور

یقین نہیں آتا کہ شاہد جیسا باغ و بہار کمیونسٹ ہر تکلیف' ہر مصیبت کو قہقہے میں اُڑا دینے والا اس طرح ایکا ایکی موت سے شکست کھا جائے گا:۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس! تم کو میؔر سے صحبت نہیں رہی

ہاں! دیوانوں میں سے ایک اور دیوانہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ کچھ عرصہ پہلے کامریڈ اقبال خان کی وفات کی خبر آئی تھی اور اب عزیز ترین رفیق شاہد رضوی کی۔ شاہد اس پراگندہ طبع عشق پیشہ دیوانوں کے قبیلے کا فرد تھا جو تلاشِ حسن کے لیے ہمہ تن خود کو وقف کردیتے ہیں' جو زندگی کے حسن' سچائی اور زندگی دشمن قوتوں کے خلاف جدوجہد کو اپنا ایمان اور آدرش بنالیتے ہیں ایسے دیوانے عاشق اب نایاب ہوتے جارہے ہیں جو اپنا سب کچھ ایک مقصد کی خاطر قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ جو دل وجان سے اس کے لیے لگے رہتے ہیں۔ کامریڈ شاہد سے میری ملاقات 1956ء

میں حیدرآباد میں ہوئی تھی جہاں مجھے کراچی سے کمیونسٹ پارٹی نے منتخب کیا تھا۔ وہ بڑا عجیب وغریب زمانہ تھا 1954ء میں کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی قرار دی جاچکی تھی حکومت کا تشدد اپنے عروج پر تھا۔ سی آئی ڈی اور دوسری خفیہ ایجنسیاں مستقل ہمارا پیچھا کرتی رہتی تھیں اس کے باوجود پارٹی کے ساتھی' یہ دیوانے' یہ پراگندہ طبع لوگ بغیر کسی پرواہ کے حکومت کے مظالم کو نظر میں نہ لاتے ہوئے اس کے چیلنج کا مقابلہ کرتے تھے وہ جدوجہد میں' انسانی زندگی اور خیر کی جدوجہد کے لیے' انسانیت کے لیے' محنت کش طبقے کی آزادی کی جدوجہد کے لیے دل وجان سے لگے ہوئے تھے۔ باوجود اس کے کہ اس زمانے میں حالات بے حد خراب تھے پارٹی کی مالی حالت بھی بہت کمزور تھی پیشہ ور انقلابیوں کو WAGES بھی بہت کم ملتے تھے اس کے باوجود ان ساتھیوں کا جوش وجذبہ' ان ساتھیوں کی لگن' ان کی جدوجہد کا جوش اپنے عروج پر تھا۔ دن رات وہ حکومت کی ایجنسیوں کے تمام ہتھکنڈوں کا مذاق اڑاتے اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔

اسی عجیب وغریب زمانے میں کامریڈ شاہد رضوی اور کامریڈ شمیم واسطی دو ساتھی' دو رفیق' دو دوست' حیدرآباد میں ٹریڈ یونین کی جان تھے۔ شاہد ناٹے سے قد کے دبلے پتلے خوبصورت خدوخال' چمکدار روشن آنکھیں اور ہر لمحہ ہونٹوں پر مسکراہٹ' بات بات میں فقرے' لطیفے گویا زندگی کی سختیوں کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہے۔ وہ سختیوں اور تکلیفوں کا مذاق اُڑانے والے لوگوں میں سے تھا۔ ان کو ہنسی میں ٹال دینے والے لوگوں میں سے تھا انہیں صرف ایک ہی لگن تھی اور وہ تھی محنت کش طبقے کی آزادی کی جدوجہد کی۔ شاہد ایک پڑھے لکھے اور باشعور نوجوان تھے جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو پہلے ہی دن ہم بے تکلف دوست بن گئے۔ شاہد اور شمیم دونوں کی آپس میں بہت بنتی تھی دونوں ہی بہت فقرے باز اور بذلہ سنج تھے شاہد چونکہ پڑھے لکھے زیادہ تھے

باشعور تھے‘ ان کے فقروں میں‘ لطیفوں میں گہرائی اور خوبصورتی ہوتی تھی ۔ اکھڑ پن نہیں ہوتا تھا وہ بات سے بات نکالنا جانتا تھا۔ یہ دونوں ساتھی ایک دوسرے کے ساتھ ایسے رہتے تھے کہ لوگ انہیں یاجوج ماجوج کہتے تھے۔ یہ دن اور رات جدوجہد میں لگے رہتے تھے حالانکہ اس زمانے میں 1957ء میں مارشل لا لگا ہوا تھا۔ وہ ٹرانسپورٹ‘ ٹیکسٹائل اور دوسری فیکٹریوں کے مزدوروں کو منظّم کرنے میں ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ کچھ سالوں کے بعد شاہد چھٹی لے کے خیر پور چلے گئے اور انہوں نے شادی کرلی۔ کچھ عرصے کے لیے ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا لیکن وہ خاموش نہیں بیٹھے وہ جہاں بھی رہے پارٹی سے ان کا تعلق قائم رہا خیر پور میں بھی انہوں نے پارٹی سے رابطہ نہیں توڑا بلکہ مستقل تعلق قائم رکھا ساتھی کارکنوں کے ساتھ مل کر مشورے دیتے رہے‘ کام کرتے رہے چھ ماہ بعد سکھر میں میرا شاہد سے دوبارہ رابطہ ہوا ان کی بڑی خوبیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے زندگی میں کبھی پارٹی سے‘ اپنے کاز سے‘ اپنے ساتھیوں سے بے وفائی نہیں کی۔ وہ ایک باوفا‘ باشعور اور دردمند ساتھی تھے جس کے دل میں ساری انسانیت کا‘ ساری دنیا کے محنت کشوں کا‘ ساری دنیا کے مظلوموں کا درد تھا وہ ان کے لیے تڑپ جاتے تھے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس کی وجہ سے وہ تمام ساتھیوں میں بے حد مقبول تھے اور تمام ساتھی اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔

میں پھر کہوں گا کہ شاہد ان عشق پیشہ دیوانوں کے قبیلے کا فرد تھا جو تلاشِ حسن کے لیے زندگی کے حسن کے لئے خود کو وقف کر دیتے ہیں۔ زندگی کے حسن‘ سچائی اور زندگی دشمن قوتوں کے خلاف جدوجہد کو اپنا ایمان اور آدرش بنا لیتے ہیں‘ ایسے دیوانے عاشق اب نایاب ہوتے جا رہے ہیں آج جب میں اپنے چاروں طرف دیکھتا ہوں تو مجھے ایسے ساتھی کم ملتے ہیں جنہوں نے اس طرح سے اپنی زندگی کو کسی آدرش کے لیے ہمہ تن جدوجہد میں لگا دیا ہو آج جب کہ حالات خصوصاً سوویت یونین کے بکھر جانے کے

بعد جس طرح کنفیوژن پھیلا ہے اچھے اچھے کامریڈز اور دوست جو کل تک بہت آگے بڑھے ہوئے تھے وہ پیچھے ہٹ گئے اور کنفیوژن کا شکار ہو گئے اور ان کی وفاداریاں متزلزل ہوگئیں ۔ کامریڈ شاہد کے ہاں اونچ نیچ تو آتی رہی مگر نہ تو خود ان کا سوشلزم پر سے یقین اٹھا اور نہ ہی محنت کش عوام کی جدوجہد سے ان کا رشتہ کبھی ٹوٹا۔ یہ ان کی بڑی خصوصیت تھی کہ وہ وقتی طور پر کبھی کبھی ڈھیلے پڑے لیکن اس کے باوجود پارٹی سے ان کی وفاداری‘ مقصد سے ان کی لگن و وابستگی کبھی کم نہیں ہوئی چاہے وہ جیل کے اندر رہے ہوں یا جیل سے باہر۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ‘ قلم کے ذریعہ اس جدوجہد کو جاری رکھا وہ ناقابل شکست کمیونسٹ تھا اس نے اپنے مقصد کے لیے چومکھی لڑائی لڑی۔ قلم سے بھی اور روزمرہ کی مزدور طبقے کی جدوجہد کے ذریعہ بھی۔ وہ ٹریڈ یونین کا کارکن ہونے کے ساتھ ساتھ کالم نویس‘ مضمون نگار اور شاعر بھی تھا اس نے اپنی شاعری‘ اپنے فکاہیہ وطنزیہ مضامین کے ذریعہ قلم کے ذریعے بھی جہاد کیا۔ شاہد کا عشق زندگی کے حسن سے‘ محنت کش عوام کی جدوجہد سے لامحدود تھا‘ یہ ہر چیز میں جھلکتا تھا اور اس کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔ زندگی کے حسن کو وہ ہر جگہ تلاش کرتا تھا۔ کچھ لوگ اسے شاید اس کی کمزوری سمجھیں یا اس کی قوت‘ اسے بچوں سے بے حد پیار تھا۔ بچے اس کی کمزوری تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارا مستقبل ہیں۔ ان کی شاعری میں بچوں پر کئی خوبصورت نظمیں ہیں۔ ان کا دردمند دل تھا جو عوام کے خلاف ہونے والی ہر زیادتی کو محسوس کرتا تھا۔ پٹ فیڈر کے کسانوں کی جدوجہد ہو یا ملتان کے مزدوروں کی جدوجہد۔ وہ ہر جدوجہد کو اپنی جدوجہد سمجھتے ہوئے قلم کے ذریعہ اپنی آواز بلند کرتا ہے۔ وہ کبھی خاموش نہیں بیٹھتا پٹ فیڈر کے کسان ہوں‘ فلسطین کے مجاہد ہوں‘ ویتنام ہو یا ملتان کے شہید ہوں سب اس کے ساتھی ہیں‘ اس کے دوست ہیں‘ اس کے رفیق ہیں جہاں جہاں بھی عوام کی جدوجہد جاری تھی اور ہے‘ شاہد نے ان کے بارے

میں لکھا ان کی جدوجہد میں اپنی آواز شامل کی۔ اپنے قلم سے' اپنی جدوجہد سے برابر ہر جدوجہد میں شریک رہا۔

کامریڈ شاہد نے اپنی اولاد کو مخلص کمیونسٹ کی تربیت بھی دی اس نے باپ کے ساتھ اپنی اولاد کو اپنا رفیق وساتھی بھی بنایا اس نے پارٹی اور محنت کش عوام کی جدوجہد کو اولیت دی۔ باوجود اس کے کہ لوگ عام طریقے سے اپنی جدوجہد میں' اپنی اولاد کو اور اپنے گھر والوں کو بچانے کی کوششیں کرتے ہیں' اس نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ وہ ایک سچا کمیونسٹ تھا سچا دوست تھا' سچا رفیق تھا۔

کامریڈ شاہد ایک انتہائی دردمند دل رکھنے والے، باغی ذہن کے کامریڈ تھے ہر ظلم، ہر تشدد، عوام کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی پر ان کا دل تڑپتا تھا جہاں جہاں بھی تشدد ہو' زیادتی وظلم ہو وہ اس کے خلاف سراپا احتجاج تھے خواہ وہ ترنم عزیز کا واقعہ ہو یا کہیں اور دہشت گردی کا۔ وہ خصوصیت کے ساتھ جرم، ناانصافی، تشدد اور ہتھیاروں کی سیاست سے متنفر تھے۔ وہ اپنے قلم کے ذریعہ ان کے خلاف سراپا احتجاج تھے' ان کی نظمیں ''ترنم عزیز'' اور ''ایک دیوانہ جو مرہی گیا'' خوبصورت سراپا احتجاج اور سراپا درد سے بھری ہوئی ہیں۔ شاہد کو اپنے ساتھیوں سے بے تحاشہ محبت تھی کامریڈ حسن ناصر اور نذیر عباسی ان کے لیے بغاوت، احتجاج اور انقلاب کے سمبل تھے۔ وہ طاقت کے بھی سمبل تھے۔ وہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ حسن ناصر نے اپنی جان دے دی لیکن اپنے کاز' اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹا، نذیر عباسی نے اپنی جان دے دی لیکن ظلم کے مقابلے میں نہیں جھکا۔ یہ تھا ان کی نظموں اور غزلوں کا نچوڑ۔ شاہد کی نظموں اور غزلوں کو پڑھنے والا ان کے خلوص، ان کی سچائی، ان کے آدرش سے بندھن، ان کے انسانی مستقبل پر یقین سے منکر نہیں ہوسکتا جن کا عکس ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ مجھے یقین ہے جو لوگ ان کی نظموں اور غزلوں کو پڑھیں گے ان کی شاعری سے، ان کے آدرش سے متاثر ہوں گے۔ ان کے کلام کی اشاعت سے ان کا مقصد زندہ رہے گا۔

موت نے مجھ سے ایک انتہائی پیارا دوست اور پارٹی سے ایک مخلص کمیونسٹ چھین لیا ہے شاہد جیسے انسان کو موت مار نہیں سکتی وہ موت سے بہت زیادہ قوی ہوتے ہیں۔

کامریڈ شاہد جیسے لوگ بظاہر مر جاتے ہیں لیکن وہ مرا نہیں کرتے، وہ ساتھیوں کے دلوں میں، اپنے کلام کے ذریعہ' اپنے عمل کے ذریعہ جو انہوں نے اپنے مقصد کے لیے کیا ہے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ پارٹی کے ساتھ ان کے گہرے بندھن تھے پارٹی کا جو ابھی نیا آئین بنا تھا اس کا مسودہ انھی نے لکھا تھا جو کانگریس میں پاس ہوا اور اس کو DEFEND کرنے کے لیے بھی انھی کو بلایا گیا تھا۔

کامریڈ شاہد کا پارٹی سے سوشلزم سے رشتہ اندھی عقیدت کا رشتہ نہیں تھا وہ رشتہ شعور کا تھا' منطق کا تھا' سائنس کا تھا۔ اندھے عقیدے کے ساتھ شاہد نے سوشلزم کو قبول نہیں کیا تھا۔ اسی لیے سوویت یونین کے زوال کا ان پر اتنا اثر نہیں ہوا جتنا ان لوگوں پر ہوا جنہوں نے اسے عقیدہ بنایا ہوا تھا وہ یہ بات جانتے تھے کہ ایک ماڈل ٹوٹا ہے۔ دس ماڈل اور پیدا ہوں گے۔ وہ جانتے تھے کہ سوشلزم ناکام نہیں ہوا۔ غلطیوں کی سزا ملی ہے انہیں یہ یقین تھا کہ سرمایہ داری کا بحران کم نہیں ہوگا یہ بڑھتا ہی جائے گا اور بڑھتا ہی جارہا ہے۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ وہ قوتیں جو اس کی وجہ سے بکھر گئی ہیں ایک مرتبہ پھر منظّم ہوں گی اس لیے کہ مزدور طبقے کی جدوجہد' طبقاتی جدوجہد جاری ہے اور جاری رہے گی جب تک کہ ایک ایسا سماج وجود میں نہیں آجائے جو کہ خوبصورت ہو جس میں سب کو برابر سے حقوق ملیں اور وہ صرف سوشلزم اور کمیونزم سے ہی ممکن ہے۔

امام علی نازش
چیئرمین
کمیونسٹ مزدور کسان پارٹی

حیراں کدے کی شاعری

''شہر وفا'' میں خارزار سے اٹے ''دشتِ حیراں'' کے انسان میں ''زندگی برائے ادب'' کی مضبوط فکر اور ترقی پسند نظریہ رکھنے والے ''شاہد رضوی'' نے اپنے شعری حسن اور شعوری لہجے سے جب اہلِ سخن کو ''حیران'' کیا تو اہلِ ادب و فکر کو اندازہ ہوا کہ ''شاہد رضوی'' نے کس خوبصورتی سے ''سائنسی سوچ'' کے استدلال، منطق اور غور و فکر سے ترقی پسند ادب کے محاسن کو نہ صرف سنبھالا دیا ہے بلکہ تخیلات کی پرورش کرنے میں منحنی جسم اور سوچ کو توانا کرنے میں تمام جزئیات کو برتتے ہوئے ''سائنسی سوچ'' کے ذریعے انسانی آدرش کے انسان دوست نکتہ نظر ''کمیونزم'' کی تفہیم کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے، سائنسی نظریئے پر یقین کی کیفیت دیکھئے کہ!

ہاتھوں میں خالی جام لئے میکدے کے پاس
معمول بن گیا ہے سرِ شام گھومنا

گویا خالی ہاتھ کے ہوتے ہوئے بھی ''شاہد'' ذہنی طور سے سائنسی فکر کی طاقت سے اپنی ابتدا ہی سے پُر یقین تھا کہ ''مارکسزم'' کا انسانی نظریہ ہی انسان کے دکھوں اور ابتلا سے نجات دلانے اور انسان کی بالادستی کو قائم رکھنے کا آخری حوالہ ہوگا، شاہد کا دنیا میں آنے والے نئے انسان کا وہ پُرامن جذبہ اور بے ہنگم لالچ و حرص میں لپٹی ہوئی سرمایہ داری کا پردہ چاک کرنے کا انداز دیکھئے کہ!

میرا بچہ
جو دنیا میں
آج ہی آیا ہے
توپوں کی گھن گرج سے ڈر کر
سہم گیا ہے
اپنے جنگی نعرے اور بموں کے دھماکے
بند کرو
میں اس کی آوازیں سننا چاہتا ہوں

جرأت اور اظہار کی آزادی کے خوگر انسان کو جب نظریئے کی مٹی سے گوندھا جاتا ہے تو اس کا تیقن جرأت اور اظہار کے تمام زاویوں کی آزادی چاہتا ہے، وہ اظہار کی آزادی کے لئے جہاں چنگھاڑنا چاہتا ہے وہیں وہ سخنوری کے جذبے لئے نہایت آہستگی سے اپنا اظہار کر ہی دیتا ہے، جرأت کی استقامت پہ یہ شعری اظہار دیکھئے کہ!

ممکن نہیں کہ جرأتِ اظہار چھین لو
ہم سے ہمارے عشق کا آزار چھین لو

شاعر کا زمانے کے مدوجزر کو دیکھنے کا اپنا زاویہ نگاہ ہوا کرتا ہے، شاعر کی حساس طبیعت میں جب انسانی بقا کے ترقی پسند نظریئے ''ادب برائے زندگی'' کی آمیزش شامل ہو جاتی ہے تو اس کی فکر اور اشعار زندگی اور انسان سے گفتگو کرنے لگتے ہیں، اس گفتگو کے دوران شاعر دنیا میں ڈھائے جانے والے استحصال اور ریاست کی انسان کش طاقت سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے وہ استحصالی قوتوں کے خاتمے کی ایک ایسی تحریک بن جاتا ہے جو شعر کے قالب میں تمام انسانوں کو ان کے جمہوری اور سیاسی حقوق لینے کی طرف مائل کرتا ہوا نظر آتا ہے، اسی کوشش میں اس کا لہجہ پکار پکار کر سوئے ہوئے ضمیروں کو جھنجھوڑنے کا وہ جز بن جاتا ہے جس سے دیر یا بدیر انسان اپنی

آزادی کے حصول کی جدوجہد میں جت جاتا ہے، پھر اس شاعر کا ظالمانہ استحصالی نظام کے خلاف لہجہ کبھی کبھی یوں بھی ہو جاتا ہے کہ۔۔۔

اے راہراوانِ مقتلِ جاں یہ بات سمجھنا لازم ہے
گر دستِ ستم کو روکنا ہے قاتل سے الجھنا لازم ہے

اور جب ریاستیں اپنے طاقت کے استعمال سے پسے ہوئے محروم طبقات کے حقوق اور وسائل پر قابض ہونا چاہتی ہے یا اس خطے کی مٹی سے جنم لینے والی نسل کشی کے لئے کمربستہ ہو جاتی ہیں تو شاہد رضوی ایسا شاعر اپنے سخن میں احتجاج اور شدید مزاحمت لئے نظر آتا ہے، شاہد رضوی کا مارکسزم کا نظریہ اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی بھی محروم طبقے کے ساتھ ہونے والے ظلم واستحصال پر خاموش رہے، وہ اپنی شاعری میں چلاتا ہے، چنگھاڑتا ہے اور دنیا بھر کی انسانی حقوق کی تنظیموں اور گروہ کو متوجہ کرنے میں اپنے قلم کی طاقت استعمال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ پسے ہوئے طبقات کے ساتھ ریاست کا غیر انسانی طرزِ عمل نہ صرف ختم ہو بلکہ وہ محکوم طبقات کے حقوق دلوانے تک چین سے نہیں بیٹھتا اور اپنی قلم سے صدائے احتجاج بلند کرتا ہے، یقین نہ آئے تو شاہد رضوی کی بلوچستان کے عوام کے حقوق کی جدوجہد میں لکھی گئی ''بلوچستان'' نامی نظم کی یہ چند سطریں دیکھ لیں کہ!

مرا گناہ یہی ہے مجھے گوارہ نہیں
کہ میری دھرتی کے ساحل پہ قتل گاہیں بنیں
ذخیرے گولہ بارود کے جمع ہوں جنہیں
کرائے کے قاتل
مرے گھروں کو جلانے میں استعمال کریں
مجھے قبول نہیں کہ تمہارے چہرے کی
سیاہیوں کا کوئی عکس اس زمین پر پڑے

مجھے قبول ہے کہ ہولناک بم برسیں
شبِ سیاہ میں بستی کا چہرہ جلتا ہو
گلی گلی در و دیوار سینہ چھلنی کئے
کھڑے ہوں نوحہ کناں
مگر غلامئ اہلِ ستم قبول نہیں۔۔۔

عشق میں رخِ زیبا کی نظر سے دنیا کے عکس دیکھنے کا چلن آپ کو عمومی شاعری میں نظر آ جائے گا، مگر عشق کے کارنس میں انسانی حیات و کائنات کے سروں میں سر دھننا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں، عشق کی اس منزل کو پانے کے لئے ذات کے عذاب سے گذر کر کندن بننا ضروری ہوا کرتا ہے، اس کندن بننے کی جستجو اور لگن جب نظریئے کی آمیزش میں رچ بس جاتی ہے تو نظریئے کا رخِ سخن ''انسانی حیات'' کے مدوجزر کو عمیق نگاہ سے دیکھنا ٹھیرتا ہے، انسان سے عشق کی اس منزل میں زندگی کے نشیب و فراز بے معنی اور بے کار سے لگتے ہیں، عشق کی اس انسانی تڑپ میں نہ رخِ زیبا اہم ہوتا ہے اور نہ نازک سے حسن و رعنائی، بس عشق کی اس انسانی محبت میں خود کو تج کر دینے کی ایک ایسی خواہش ہوتی ہے جس کے نتائج میں شاعر کی آخری خواہش انسانی زندگی کی بقا اور اس کے حق کے لئے تن من دھن قربان کر دینا اس کا حاصل ہوتا ہے، اگر عشق کی انسانی اور نظریاتی امنگ اور فکر دیکھنی ہو تو شاہد رضوی کے اس شعر کو بار بار سنیئے، دیکھئے اور داد دیتے رہیے کہ!

عشق میں فرصتِ یک لمحہ نہ پائی ورنہ
سوزشِ زخمِ جگر کا بھی مداوا کرتے

کہتے ہیں کہ زندگی کے غمِ روزگار سے کبھی کبھی چھٹکارا پانا بھی شعوری عمل ہوتا ہے اور پھر جب یہ شعوری عمل سخن پرور کی زندگی میں آتا ہے تو وہ اپنی آسودگی کے چند لمحات اپنی زندگی کی اس چاشنی کو دینا چاہتا ہے جس میں کہ شاعر شاید اپنی تن آسانی کو خود منتخب

کرتا ہے‘ ایسا ہی کچھ شاہد رضوی نے اپنے مجموعے ’’شہرِ وفا‘‘ کے آخری حصے میں اپنی حس ظرافت کے چند نمونے مجموعے کی زینت بنائے ہیں جن کو شاہد رضوی نے ’’کشتِ زعفران‘‘ قرار دیا ہے، شاہد رضوی کے اس کشتِ زعفران کو دیکھئے تو ان میں ان کے مزاج کی چٹکی بھرنے والی طبیعت نظر آئے گی، جیسا کہ!

چھیڑ خوباں سے چلی جائے مگر یوں نہ ہوں
اس طرف جان ادھر جانِ تمنا نکلی
ایک غلطی سے بپا ہوگیا ہنگامہ حشر
میں پڑوسن جسے سمجھا تھا وہ زوجہ نکلی

یا شاہد رضوی کا یہ زعفرانی انداز دیکھئے کہ!

بے سوچے آپ کرنے لگے ہیں مطالبہ
اسلامی عدل کا یہاں پرچم علم کریں
ایسا نہ ہو کہ تفرقہ بازی کے جرم میں
مولانا! پہلے آپ کا ہم سر قلم کریں

شاہد رضوی کے دوسرے مجموعے ’’دشت حیراں‘‘ کا مطالعہ کیا جائے تو اس مجموعے میں مختلف اشعار سمیت 165 سے زائد ’’کیفیتی تبدیلی‘‘ کی غزلیں ملیں گی جن میں حسن و عشق کی نرم گدازی کے ساتھ زندگی کے لمحات میں ابتلائے انسان کے دکھ درد سمیٹنے کا فن بھی نظر آئے گا، مذہب کے پردے میں ریاکاری کا عمل کسی بھی مہذب معاشرے میں قابلِ قبول نہیں ہوتا، مذہب کے چولے میں انسان کی سادگی سے کھیلنا اور انسانی سماج میں فرد کے انسانی و جمہوری حقوق کو غصب کرنا شاہد رضوی کو بھلا کیسے ہضم ہوتا، اسی واسطے انہوں نے مذہب پسندوں کے اس دوغلے پن پر بھی اپنی رائے دینے میں کوئی تردد نہ کیا اور کہہ گئے کہ!

اس شہر تجارت میں ہر چیز میسر ہے

کتنے کا نبی لو گے کتنے کا خدا لو گے

مگر کبھی کبھی شاعر کے لئے جبلی صفت کے مطابق حسن کی تعریف اور حسن کے بیان کو پیش کرنے کا اپنا ایک منفرد انداز بھی ہوتا ہے جو شاعر کے اندر چھپی ہوئی کیفیت اور اس کے اظہار کا وہ زاویہ بن جاتا ہے کہ حسن کے بارے میں مذکورہ شاعر کی ندرت ایک عجیب سے اور کیفیت میں لے جانے کا محرک ہوتا ہے، جہاں شاہد رضوی نے اپنے کمیونسٹ آدرشوں سے پیار کیا وہیں شاہد رضوی نے مارکس کے ’’فلسفہ عشق‘‘ کو بھی اپنی فکر کا زاویہ بنایا، اسی حسن و عشق کی کیفیت کی تلاش میں شاہد رضوی جب یہ کہے کہ!

ایسی آیت حسن پہ پہلے کب اتری
ختم اس عارض پر ہم نے حجت کرلی

اور اسی کیفیت میں شاہد رضوی کو جب حسن میں جذب ہونے کا نشہ چھانے لگے تو شاہد فوری طور سے اس کیفیت سے شعوری طور سے باہر آنے کا راستہ بھی اتنی ہی خوبصورتی سے تلاش کرتے ہیں جتنی بے ساختگی سے حسن میں گم ہوجانے کو، سو اس شعوری کیفیت کے شاعر کے فکری میلان اور رجحان کو سمجھنا بہت ضروری ہے، وگرنہ حسن میں گم ہونے کے دوران یہ کہہ دینا کہ!

جب جی چاہا اہلِ خرد میں جا بیٹھے
جب جی چاہا وحشت کی عادت کرلی

اس بات کی گواہی ہے کہ شاہد رضوی کی شاعری میں عمومی طور سے باشعور انداز کا ہونا اس کے مارکسی نظریات کی وہ پختگی ہے جس سے کسی بھی لمحے شاہد رضوی نے نہ مفر کیا اور نہ کبھی انکار کیا بلکہ شاہد رضوی اپنے نظریئے کی پختگی کے ساتھ ادب وتہذیب کی چاشنی سے سماج کے ان المیوں کا ذکر نہایت شائستگی سے کرتے رہے، جو کہ طاقتور قوتوں کے مکارانہ عمل اور انسان کش سازشوں سے عام انسان بھگتتا رہا، شاعر کے اپنے زاویئے اور سوچ کے آہنگ ہوتے ہیں، اس کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے زاویئے کبھی اس

میں مزاحمت کا روپ دھارتے ہیں تو کبھی شاعر اپنے خیال میں حسن و عشق کے ایسے گداز ماحول میں خود کو پاتا ہے کہ اس کی روح وقتی طور پر مطمئن سی لگتی ہے، مگر یہ اطمینان نہ دائمی ہوتا ہے اور نہ ہوسکتا ہے، بلکہ اس شاعر کی بے چین طبیعت اور زندگی کے مختلف زاویوں پر مکمل اطمینان ہی اس کی موت ہوتا ہے، اسی لئے کبھی شاعر خلوت کے لمحوں میں یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ!

ایسی آیت حسن پہ پہلے کب اتری
ختم اس عارض پر ہم نے حجت کر لی

یا

کچھ نیند کے جھونکوں کو ملے زلف کا سایہ
کچھ خواب تیری عنبریں بانہوں پہ رقم ہوں

زمانے کے رویّے اور برتاؤ کا گھاؤ ایک ایسا تکلیف دہ لمحہ ہوتا ہے جو شاعر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے، شاعر زمانے کے اس گھاؤ پر چیخنا چاہتا ہے، چلانا چاہتا ہے، مگر شاعر کی طبیعت میں تہذیب اور شائستگی کا رچاؤ اسے احتجاج کا بھی ایک ایسا تہذیب یافتہ راستہ دکھاتا ہے کہ وہ زمانے کے گھاؤ میں بھی نرم لہجے میں سخت احتجاج کر ہی دیتا ہے، جیسا کہ شاہد رضوی کا یہ شعر کہ!

کارِ دنیا غم جاناں سے بھی مشکل نکلا
یہ زمانہ تو مری جاں بڑا قاتل نکلا

شاہد رضوی کے مجموعے ''شہرِ وفا'' اور ''دشتِ حیراں'' کا اگر اجمالی جائزہ لیا جائے تو شاہد رضوی سماج اور اس کی زندگی سے جڑا ہوا وہ باشعور شاعر نظر آتا ہے کہ جس نے اپنے ابتلا اور مسائل سے ہٹ کر شاعری کے میدان میں اپنی خود پسندی کو ترقی پسند نکتۂ نظر کے تحت شکست دی، اور شاید یہی محض وہ وجہ ہے کہ شاہد رضوی نے مشاعروں کی چکا چوند اور سہاروں کی شہرت سے اجتناب برتا، شاعری اور زندگی کے بارے میں

شاہد رضوی کا پختہ نقطۂ نظر تھا کہ شاعری کے محاسن اور شاعری میں سماج کے رویوں سے کی گئی گفتگو اور پیرائے کبھی نہ باسی ہوتے ہیں اور نہ کبھی ان کی قدر میں گھاٹا نقب زنی کرتا ہے، شاہد رضوی کا یہی یقین اس کی شاعری اور ادب کے بے ہنگم رویوں پر وہ سبق یا احتجاج ہے، جس سے آئندہ کی شاعری کا وہ ترقی پسند نظریہ فروغ پائے گا جو کہیں آپسی مفادات میں گم سا ہو گیا ہے۔

اس مرحلے پر شاہد رضوی کی بیٹی رعنا اور پورا کنبہ جس تندہی اور باشعور سوچ کے ساتھ شاہد رضوی کے افکار اور شاعری کے ساتھ کھڑا ہے وہ ہی ترقی پسند سوچ کا وہ پیغام ہے جو اپنوں کی میراث کو کھونے نہ دینے پر کامل یقین رکھتے ہیں، کنبے کی انتھک محنت اور شاہد رضوی کے کلام کو عام فرد تک رسائی دینے یا منظر عام کرنے پر تمام باشعور بیٹیوں کو سرخ سلام۔

وارث رضا

طبقاتی شعور کا نمائندہ شاعر

انسانی تاریخ جتنی پرانی ہے اتنی ہی شاعری کی روایت بھی پرانی ہے۔اس لیے وثوق سے یہ کہہ دینا کہ اِس عہد میں شاعری کا آغاز ہوا ہے انتہائی مشکل ہے، کیونکہ انسان نے جب سے گفتگو شروع کی غالباً تب سے شاعری کا بھی آغاز ہوا۔ بہرحال شاعری کی روایت سے بھی اہم موضوع اس کے منصب کا رہا ہے کہ سماج میں اِس کی اہمیت وافادیت کیا ہونی چاہیے!!؟ اس پر ہر دبستان کا اپنا نقطۂ نظر ہے لیکن ہر تخلیق کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے، اس لیے شاعری کی بھی ایک اہم وجہ گفتگو کرنا ہے، اور یہ گفتگو محض ذات کی تشفی تک محدود نہیں ہوسکتی بلکہ احساس اور نظریات کی ترجمانی بھی ہے۔ جوں جوں دور واطوار بدلتے ہیں شاعری کا لب ولہجہ اور انداز بھی بدلتا ہے، سوچ کا زاویہ اور اندازِ فکر میں بھی تغیر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شعر وادب کے موضوعات اور عنوانات، اسالیب، کرافٹ اور مرصع سازی ہنوز ترقی کی جانب گامزن ہیں۔ایک عرصے تک مثنوی اور قصیدے نے اقلیم سخن پر حکمرانی کی، پھر غزل نے اُس کی جگہ لی، غزل موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے عجیب صنف ہے، اس میں جتنی وسعت ہے اتنی پابندیاں بھی ہیں، اس کا متبادل نظم میں تلاش کیا گیا۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک نے نظم اور غزل کو نت نئے موضوعات سے آشنا کیا۔بعض ناقدین نے ترقی پسند شاعری کو نعرہ بازی قرار دے کر خطِ تنسیخ پھیرا جبکہ علامہ اقبال کی سیاسی اور مذہبی شاعری کو سرآنکھوں پر رکھا گیا اور دیگر شعرا کو یکسر رد کر دیا گیا، یہ معیار تعصب کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ

میزان کے پلڑے برابر نہیں رکھے گئے لیکن ذاتی پسند اور ناپسند کی نقد میں حیثیت ثانوی رہتی ہے۔اس لیے تمام تر الزام ودشنام کے باوجود ترقی پسند شاعری بنجر زمین کو سیراب کرتی رہی، صحرائے فکر میں نخل اُگاتی رہی، اور اس کا ثمر بعد کے شعرا نے بھی سمیٹا، طرح طرح کے موضوع، ہیئتی تجربات، اسالیب کے نئے ڈھب، اندازِ تکلم میں تنوع، اِسی تحریک کی دین ہے۔اس تحریک نے تصوراتی خوبصورتی کو محنت کش طبقے میں مجسم کیا، اور اس عمل پر اس تحریک کو سیاسی قرار دیا گیا، پھر جبر کی اک لمبی داستان ہے، جس کا آغاز بھی خون، اور روایت بھی خون ہے۔

شاہد رضوی کا تعلق بھی اِسی انقلابی قبیلے سے رہا جو شعر کو عوامی شعور سے عبارت کرتے ہیں، اور عوام کے جذبات کی ترجمانی ہی شاعری کا منصب سمجھتے ہیں، شاہد رضوی فکری طور پر کمیونسٹ نظریات سے متاثر تھے اور عملی طور پر بھی محنت کشوں کی تحریک سے جڑے رہے۔وہ کسانوں کی جدوجہد ہو، یا ایم آر ڈی کی تحریک ہو، یا پھر طلباء کی تحریک ہو، یہ سب سے آگے کھڑے دکھائی دیتے ہیں، لیکن جہاں سیاسی طور پر متحرک رہے وہیں پر مشقِ سخن بھی جاری رکھی، جو دیکھا لکھ دیا، جو محسوس کیا، اشعار میں منتقل کر دیا، ان کی شاعری اپنے عہد کی تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں شعور، تخیل اور مرصع سازی کے ساتھ شعلۂ فکر بھی فروزاں ہے جس نے ماحول کو روشن رکھا ہوا ہے۔

مارکس نے کہا تھا کہ انسانی تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے، جبکہ یہ فلسفیانہ اور سیاسی نقطہ ہے، لیکن اِسی نقطے کو شاہد رضوی نے اپنی نظم ''یومِ مئی'' میں جس انداز سے رقم کیا ہے وہ تخیل اور شعور کی بلند سطح ہے۔

ظلم کی شہر پناہ
ریزہ ریزہ بکھرے گی

جبر کے بتوں کی سانس
لمحہ لمحہ اُکھڑے گی
اُن کے ماتھے کی شکن
وقت قرض لیتا ہے
بھوک بانٹنے والے
ظلم ڈھالنے والے
کیسے بچ کے نکلیں گے
وقت کی گذرگاہ سے
وقت کی گذرگاہ پہ
یومِ مئی کا قبضہ ہے

انسانی تاریخ میں یومِ مئی فیصلہ کن گھڑی تھی، ایک طرف زردار تاجر اور دوسری جانب خستہ حال محنت کش، ایک جانب جبر کی روایت تھی دوسری طرف قربانی و ایثار کا قوی جذبہ تھا، ایک طرف موت کے سوداگر تھے اور دوسری جانب جان کا نذرانہ پیش کرنے والے متوالے تھے، اور کئی صدیاں بیت جانے کے بعد بھی ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے، اس نظم کا یہ مصرعہ ''وقت کی گذرگاہ پہ یومِ مئی کا قبضہ ہے'' پوری انسانی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے، اس ضمن میں مجنوں گورکھپوری یوں رقم طراز ہیں کہ ''جب موجود میں ممکن، واقعہ میں تخیل اور حال میں مستقبل کا عنصر شامل نہ ہو، ادب وجود میں نہیں آتا'' اور اس نظم میں شاعر کا تخیل رسا اور حال میں مستقبل کی اوٹ فکری بنیادوں پر دکھائی دیتی ہے، شاعر کی نگاہ مردم شناس اور وقت کی دھڑکن سے واقف ہے، اسی لیے تاریخ کی ارتقا پر یومِ مئی کا قبضہ دیکھتے ہیں ۔اس کے علاوہ ان کے پاس طبقاتی شعور انتہائی

پختہ اور سماجی ارتقاء پر استوار ہے جس کی جھلک اس نظم میں نمایاں دکھائی دیتی ہے۔

اس شہرِ تجارت میں ہر چیز میسر ہے
کتنے کا نبی لو گے کتنے کا خدا لو گے
انصاف تو ہوتا ہے معیار الگ ہوں گے،
میں ساری سزا لوں گا تم ساری جزا لو گے

یہ نظم سرمایہ دارانہ معاشرت کی برہنہ تصویر ہے۔ جس معاشرے میں تجارت اور منافع کو مقدس تصور کیا جاتا ہے، وہاں ہر شے بکتی ہے۔ خواہ وہ انسانی زندگی کی ضروریات ہوں یا پھر جذبات و احساسات ہوں۔ عقائد ہوں یا عدل و انصاف کا میزان ہو بے مول بک جاتی ہیں۔ بس خریدار کے پاس قیمت ہونی چاہیئے۔ ممکن ہے کہ ساختیات اور پسِ ساختیات کے داعی اس نظم کو سیاسی لفاظی قرار دیں، اور دقیق اور گنجلک اصطلاحات سے ادب کو مزید پیچیدہ بنا دیں، لیکن سچائی یہ ہے کہ شاعری فطری اور انسانی حُسن سے عبارت ہے، اور جب انسان کا تذکرہ ہوگا تب انسانی سماج اور معاشرت کی بات بھی ہوگی، ان کے رہن سہن، طور واطوار، پیداواری رشتوں کا ذکر بھی ہوگا کیوں کہ اس کے بغیر انسانی حُسن نامکمل ہے، بے سود اور لایعنی ہے، لاحاصل ہے، نیز انسانی سماج کی تشکیل پر بھی فکری طور پر یومِ مئی کا قبضہ ہے، جس کو فراموش کر دینا اتنا آسان نہیں ہے۔

رضوی صاحب کی بیشتر نظمیں درد اور دار کی داستان سے تعلق رکھتی ہیں، خواہ وہ حسن ناصر کی شہادت پر ہوں یا نظیر عباسی کی المناک شہادت ہو، یا پھر تاریخ کی سیاہی نے خفیف سی روشنی کو تختہ دار پر چڑھا دیا ہو، وہ پٹ فیڈر کے کھیت ہو یا ملتان کی کارگاہ ہو، ہر ایک واقعہ درد ہے، ہر ایک لمحہ درد سے عبارت ہے لیکن اِسی درد میں محض فریاد

نہیں، صرف چیخ نہیں بلکہ نئی روشن صبح کی نوید اور بشارت بھی ہے اور اُسی نوید سے شاہد رضوی اپنی نظمیں بُن رہے ہیں، جس کی قیمت نقدِ جاں ہے اور صلہ سورج۔

ہم اپنے لہو کی اُڑتی چھینٹوں کے انجام سے واقف ہیں
جب تارے ڈوبنے لگتے ہیں سورج کا اُبھرنا لازم ہے

ان کی نظموں کا لہجہ خطابانہ کے بجائے بیانیہ ہے، منظر کشی کی جگہ پیکر کشی ہے، الفاظ کا چناؤ بھی قابلِ رشک ہے، اور کوئی ایسا موضوع یا واقعہ نہیں جس پر انھوں نے نظم نہ کہی ہو، خواہ وہ واقعہ سیاسی ہو یا سماجی نوعیت کا کیوں نہ ہو، نیز فیض احمد فیض صاحب نے کہا تھا کہ مشاہدہ کے ساتھ مجاہدہ بھی ہونا چاہیے اور یہی پہلو ان کی نظموں میں نمایاں دکھائی دیتا ہے، ان کے ابلاغ میں بھی نظم کے ساتھ ساتھ ان کی غزلیں جداگانہ آہنگ رکھتی ہیں، اک عجیب کیف وسرور سے سرشار ہیں سب میں رہ کر بھی سب سے منفرد آواز ہیں ، میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ان کی فکری وابستگی اور نظریاتی اساس مارکس ازم نہ ہوتا تو شاید ان کی شاعری میں اجتماعیت کے بجائے داخلی کرب کی بہتات ملتی ، ہر چند کہ ان کی داخلی اذیت بھی معنی خیز ہے، اُس میں بھی انسانی شعور، طبقاتی شعور کا مکمل اور جامع ادراک ملتا ہے، آیئے ان کی غزلوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور تخیل کی اُڑان دیکھتے ہیں۔

بڑے خلوص سے کرتے ہیں تعزیت میری
وہ میرے دوست جنھوں نے کیا ہے قتل مجھے

......

آشفتہ سری، سنگ ملامت، دلِ پُرخوں
اس شہر میں جینے کا ہنر سیکھ رہے ہیں

......

اب تو سفر کی عادت ایسی ہوگئی ہے
کبھی کبھی تو گھر بھی رستہ لگتا ہے

......

دل پہ دستک دے کے لمحہ بھر بھی نہ ٹھیرا
جانے کس بستی میں وہ آوارہ گرد تھا

......

ہم نے اکثر ایسے کاٹی تیری یاد کی شب
نہ آنکھوں کی جلن گئی نہ جھونکا سرد تھا

......

یہ کائنات مری خوشبوؤں میں لیتی ہے سانس
ہوا کے لہجہ میں ہوں صبح کی نظر میں ہوں

......

اُس کم گو کم آمیز کی یادیں بھی عجب ہیں
سب شور شہر کا سمٹ آیا مرے گھر میں

......

برکھا رُت میں کمرے کی چھت بیٹھ گئی تھی
آنگن میں سیلاب چلے ہیں یاد تو کرلیں

......

لذتِ ہجر و وصل عشق کا کھیل ہے
لطف ہیں سینکڑوں ایک ہی نام ہے

......

بے آب گزاری ہوئی صدیوں کی طلب ہے
دریاؤں کی پیاس آگئی ہے سوکھے شجر میں

......

مکھیا نے وہ نیم کا پیڑ ہی کٹوا ڈالا
گاؤں والے دھوپ میں کس کا سایہ ڈھونڈیں

......

زندگی کا بھی سلوک ہم سے ہے جاناں جیسا
دشمنِ جاں کی طرح دستِ شفا کی مانند

ان کی غزلوں میں لہریں ہیں، کبھی نشیب تو کبھی فراز، زندگی کی مانند، ہلکی سی آہ اور پھر حیات کی گردش۔ چنانچہ ان کی شاعری میں سماجی شعور کے ساتھ ساتھ ان کا اپنا تجربہ، جذبہ اور خیال بھی سانس لے رہا ہے، جس میں کرافٹ بھی ہے اور اسلوب بھی ہے، ان کے پاس مرصع سازی سے زیادہ برجستگی پائی جاتی ہے، جذبات کا اُمڈ آنا ہی شعر کا حُسن ہے، اور یہی حُسن ان کی غزلوں میں بکھرا پڑا ہے، جس کو طشت از بام کرنے کی ضرورت ہے' لہٰذا ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں، ادب کا طالب علم ان کے شعری محاسن، فکری اور لفظیات کی خوبصورتی پر تحقیق کرے۔ سچ یہ ہے کہ شاہد رضوی صرف شاعر نہیں بلکہ بڑے شاعر ہیں جن کے یہاں تخیل کی اُپج، کرافٹ اور احساس کی دھیمی آنچ ہے۔

بہر کیف میں ذاتی طور پر ان کی صاحبزادی رعنا رضوی کا بے حد مشکور وممنون ہوں کہ انھوں نے دیارِ غیر میں روزگار کی ہزاروں پریشانیوں کو زندگی کے ایک شیلف میں رکھ کر، اس کلیات کو مرتب کیا، نیز ان سے رابطہ ہونا بھی ایک ٹریجڈی سے کم نہیں ہے، فیس بک کے ذریعہ بات چیت ہوئی رفتہ رفتہ اعتماد کا رشتہ استوار ہوا پھر انھوں نے اپنے والد کی کلیات مرتب کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، یہ کام بھی جوئے شیر کے مترادف تھا، کہاں کینیڈا کا سرد ماحول اور کہاں پاکستان کی گرم مارکیٹ! روزگار کے مسائل، گھر

کے جھمیلے، بچوں کی دیکھ بھال، اور کبھی صحت کے مسائل ان تمام چیزوں کے باوجود والد کی ڈائری سے اشعار کو کمپوز کرنا، اذیت ناک اور تھکا دینے والے کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینا، واقعی داد کی مستحق ہیں، ہر چند کہ اس کام میں ان کی دوسری بہنوں نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی ہوگی، بلکہ بڑی بہن کی دائیں اور بائیں بازو بن کر معاونت کی ہوگی، کلیات شایع ہونے کے بعد ان تمام بہنوں کی خوشی قابلِ دید ہوگی، جبکہ ان کے خاندان میں مزید ایک فرد کا اضافہ بھی ہوا، کیونکہ تخلیق، تخلیق کار کی اولاد ہی ہوتی ہے، ابھی رواں سال ہی شاہد رضوی صاحب کا مقالہ ''پریستورائیکا'' بھی شائع کروا چکی ہیں اور اب کلیات شائع ہو رہی ہے، لہٰذا عوام کو دینے کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

محبتیں

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

شبیر آزاد
کراچی، سندھ
03122487804
shabiriba70@gmail.com

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

27 سال ایک طویل عرصہ ہوگیا ہے ہمارے والد کو ہم سے بچھڑے ہوئے۔ 31 اگست، 1997 کی شب میں ہماری زندگی ہمیشہ کے لئے بدل گئی جب دل کا ایک جان لیوا دورہ ہمارے والد کو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر گیا ان 27 سالوں میں نہ جانے کتنا کچھ بدل گیا ہے یا یوں کہا جائے کہ جانے کتنا پانی پلوں کے نیچے سے گذر گیا ہے مگر لگتا ہے وہ لمحہ جیسے منجمد ہوگیا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ کوئی اپنے پیاروں سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے تب بھی زندگی آگے بڑھتی رہتی ہے زندگی رکتی نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی پھر کبھی بھی پہلے جیسی نہیں رہتی۔ والدین سے بچھڑنے کا دکھ جانے اس دنیا میں بے شمار بیٹیوں نے سہا ہوگا مگر ہم نے ایک ساتھ دو رشتے کھو دیئے والد اور دوست۔ اس لمحہ کے بعد سے نجانے کتنی ان کہی باتیں ہیں جو کسی سے بھی شیئر نہیں ہوسکیں بہت سے رشتوں کے آس پاس ہونے کے باوجود بھی بچھڑ جانے والے رشتوں کا خلاء دل میں ہمیشہ رہتا ہے چاہے کوئی دکھ ملے یا سکھ۔ ان رشتوں کی کمی کا احساس دل کو گھیرے رہتا ہے اس دنیا سے جانا تو ہے لیکن پاپا بہت جلدی چلے گئے۔

جس وقت ہمارے والد کا انتقال ہوا ان کی دو شعری مجموعے طباعت کے آخری مراحل میں تھے جو 1998ء میں شائع ہوئے مگر ہم ان کے غیر مطبوعہ کلام کو شائع نہ کروا

سکے۔ وجہ، دیارِ غیر کے بہت سے مسائل تھے اور جب شائع کروانے کا ارادہ کیا تو غیر متوقع طور بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا اور دیر سے دیر ہوتی چلی گئی ان کا غیر مطبوعہ کلام ''قبائے جنوں'' کی شکل میں اس کلیات میں شامل ہے کوشش کی گئی ہے کہ ان کے سارے کلام کو کلیات میں سمیٹ لیا جائے۔

ہمارے گھر میں اکثر مشاعرے ہوتے تھے ادبی محافل منعقد ہوتی تھیں میرے والد ایک ترقی پسند شاعر تھے ان کی شاعری جہاں مزاحمتی جدوجہد کا استعارہ ہے اور وہ دنیا میں ہونے والی ہر نا انصافی کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں وہاں ایک ایسے مستقبل کی امید و روشنی دکھاتے ہیں جو نا انصافی، ظلم اور استحصال سے پاک ہوگا ان کی شاعری انسانی جذبات و احساسات، خوشی و غم کی خوبصورت عکاسی کرتی ہے ان کی ایک نظم جو انہوں نے اپنی سالگرہ پر لکھی ''31 دسمبر'' اس میں ایک انتہائی خوبصورت انداز میں اظہار کیا کہ زندگی کا ایک اور سال چلا گیا، زندگی سے کیا ملا، زندگی میں کیا خواہشات باقی ہیں اور زندگی سے کیا چاہیے

چند سال اور ٹھہر
اک ترا قرض ہے وہ بھی ادا کر لینے دے
دشمنوں سے ترے اک جنگ ہے آغاز مری
فتح پا لوں تو چلوں
پیاس کے صحرا میں نہروں کی نئی فصل اگا لوں تو چلوں
بھوک کے کانٹے میں راہوں سے اٹھا لوں تو چلوں
آنے والوں کے لئے کھولوں در راہ نجات
اپنی نسلوں کو نئی راہ دکھا لوں تو چلوں
میرے بچوں کو ابھی پڑھنا بھی ہے سادہ ورق لکھنا بھی

امن کی روشنی نگری میں اجالوں تو چلوں

ان کی شاعری میں قلم کی عظمت کا، اسکی عزت کا اظہار کئی جگہ ملتا ہے

اے اہلِ قلم اے اہلِ زباں کیا اس کے سوا ہے مصرف جہاں

جب حرمت حرف ولب پہ بنے تب جاں سے گزرنا لازم ہے

ان کی بہت سی غزلیں اور نظمیں دنیا میں ہونے والے بہت سے نمایاں واقعات پر لکھی گئی ہیں چاہے وہ بیروت ہو، سویت یونین کے آئین میں تبدیلی ہو یا کراچی میں طیارہ ہائی جیک کرنے کا واقعہ ہو۔ ان نظموں کے صفحات پر ان واقعات کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کردی گئی ہے تاکہ نئی نسل ان نظموں کو پڑھے تو ان کے محرکات کے بارے میں معلوم ہو۔

ہمارے والد کی بہت سی نظمیں اور غزلیں روزنامہ ''مساوات'' اور ''امن'' میں شائع ہوئیں۔ وہ ایک شاعر ہی نہیں بلکہ کالم نگار اور مضمون نگار بھی تھے۔ ان کے آرٹیکلز اور فکاہیہ کالم روزنامہ ڈان، دی نیوز، سٹار، مساوات اور امن میں باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے ان کا کالم ''پردہ زنگاری میں'' جو ماہنامہ ''روشن خیال'' میں باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا' بہت مشہور ہوا۔

یحییٰ خان کے دور میں ایک آرٹیکل لکھنے پر انہیں گرفتار کیا گیا تھا اس وقت وہ پی آئی اے میں ملازمت کر رہے تھے ان ہی دنوں ان کی ملازمت چلی گئی ان کو ذیابیطس بھی ہوگئی تھی۔ ایک طرف وہ غم روزگار سے نبرد آزما ہوتے رہے' دوسری طرف اپنے قلم سے دنیا بھر میں ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرتے رہے پھر انہیں اسٹیل ملز میں ملازمت مل گئی۔ اسٹیل ملز سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ایک نیوز ایجنسی پی پی آئی کو جوائن کرلیا۔ زندگی کے آخری دنوں میں وہ ایک انگریزی ماہنامہ میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کر رہے تھے۔

رات کو دیر تک لکھنا ان کا معمول تھا چاہے وہ کتنی ہی دیر سے گھر آئیں مگر وہ لکھتے ضرور تھے ایسا لگتا تھا جیسے لکھنا چاہے وہ شاعری ہو یا نثر ہو ان کی زندگی کا اٹوٹ حصہ تھا۔

ان ہی کا ایک شعر ہے

جسم کا سارا لہو لگ جائے

تب کہیں شعر میں رنگ آتا ہے

2019ء میں شبیر آزاد نے فیس بک کے ذریعے ہم سے رابطہ کیا اور اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں ہمارے والد کے دونوں شعری مجموعوں ''شہرِ وفا'' اور ''دشتِ حیراں'' کو شامل کیا اور اس وقت ایک طمانیت کا احساس بھی ہوا کہ ہمت کر کے ہم نے جو شعری مجموعے ''شہر وفا'' اور ''دشتِ حیراں'' 1998ء میں شائع کروائے تھے وہ محنت رائیگاں نہیں گئی انھوں نے ہمارے کلیات چھپوانے کے ارادے کی بھی بہت حوصلہ افزائی کی۔

ہم اپنے والد کے انتہائی قریبی دوست ندیم اختر بھائی کے انتہائی ممنون اور مشکور ہیں جن کی رہنمائی اور مدد کے بغیر اس کلیات کو چھپوانا ہمارے لئے ناممکن تھا۔

امید ہے کہ ان کا کلام اردو ادب کی ترقی پسند شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ ثابت ہوگا

ہیرے تراشے ہیں کوئلہ سے یہی صفت آتی ہے

جس مصرع کو ہم نے چھوا وہ ہیرے کی کان ہوا

شاہد رضوی

رعنا رضوی

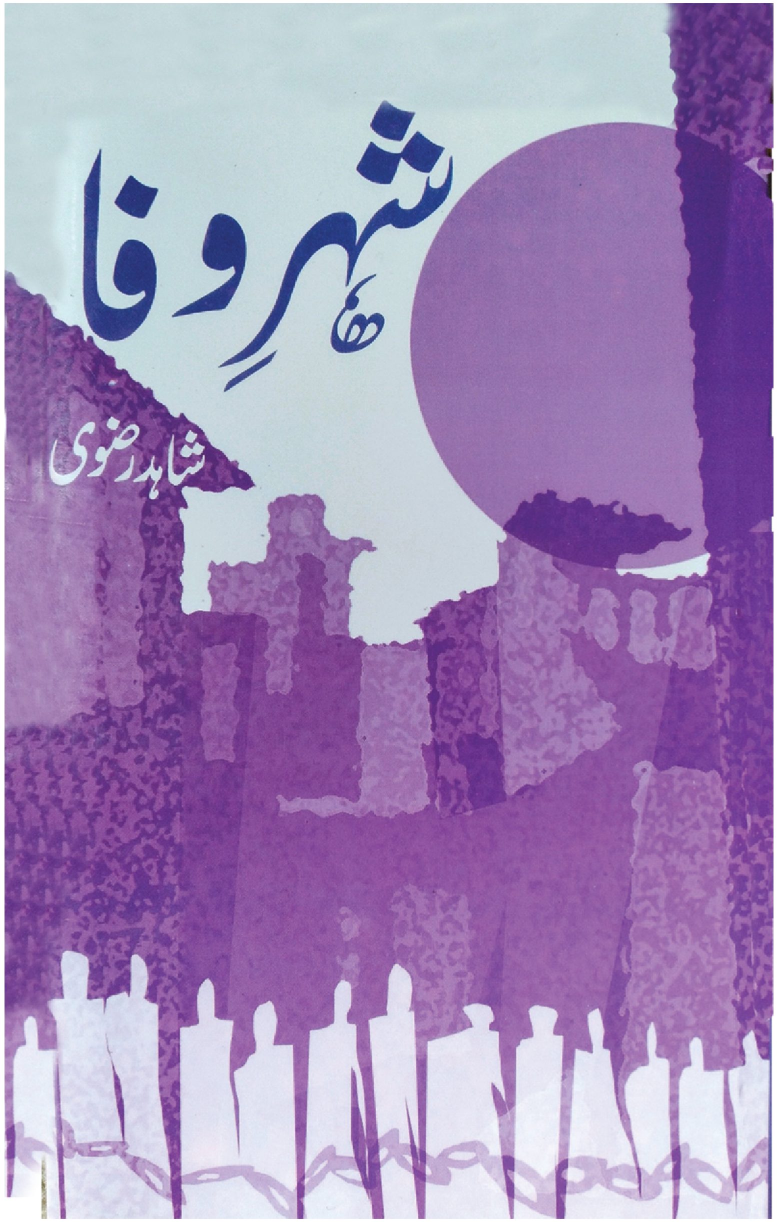
شہرِ وفا
شاہد رضوی

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبراویں گے کیا

غالبؔ

بجا ہے وحشتِ دل صبح ہونے دو رضوی
کہاں چلے ہو شہر میں ابھی اندھیرا ہے

شاہد رضوی

فہرست

☆...... میرا بچہ ۴۶
☆......سنگریزوں سے محبت کے ترانے ۴۷
☆......تیری آس پہ زندہ ہیں ہم، جانِ جاں آواز تو دے ۴۸
☆......بنجاروں سے پیار کرو گے آخر میں پچھتاؤ گے ۴۹
☆......رشتے ۵۰
☆......ممکن نہیں کہ جرأتِ اظہار چھین لو ۵۲
☆......دیارِ شعلہ رقصاں ہے یاں سنبھل کے چلو ۵۳
☆......پتھر مارنے والوں مبارک، آج دوانہ مر ہی گیا ۵۵
☆......بڑے عذاب ہیں انسان کو آگہی کے لیے ۵۶
☆......اے راہروانِ مقتلِ جاں یہ بات سمجھنا لازم ہے ۵۷
☆......بلوچستان ۵۸
☆......ذوقِ طلب انسان کا حریف ۶۰
☆......اک پل کے لئے لہرا کے گرا ۶۱
☆......حریمِ حسن میں دل کا وقار باقی رہے ۶۲
☆......سونا رستہ دور سویرا دیے جلائے رکھنا ۶۳
☆......میں اپنے خیمہ میں شب گزیدہ ۶۴
☆......گولیاں چاٹ گئیں سینہ فگاروں کے بدن ۶۶

☆......ترنمِ عزیز ۶۷
☆......شام ہوئی اور کھل گیا موسم ۶۸
☆......ہم پٹ فیڈر کے جیالے ہیں ۶۹
☆......میرا ساتھی وہ مرا دوست مرا رہنما ۷۱
☆......قبائے زخمِ دلِ ناتواں پہ سجتی ہے ۷۲
☆......کہیں شعلوں کی کہیں خونِ رواں کی تحریر ۷۳
☆......ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا الجھا ہوا ہے چاند ۷۴
☆......قرضِ عہدِ وفا چل آج چکا دیں اے دل ۷۵
☆......اے نگارِ وطن ۷۶
☆......دلِ برباد کی تصویر سی بن جاتی ہے ۷۸
☆......ان مقامات پہ ہم راہ میں اکثر ٹھیرے ۷۹
☆...... اک شمع اور جلی عمرِ رواں اور بڑھی ۸۰
☆......آج پھر اپنے دکھوں سے میں پشیمان پھرا ۸۲
☆......نہ قتیلِ درد و فا کوئی نہ نثار عارض و لب کوئی ۸۴
☆......کیا کیجیے وضع جیب و گریباں کی احتیاط ۸۵
☆......دل پر وفا کا قرض ہے جاں پر لہو کا قرض ۸۶
☆......زد میں ہوں بگولوں کی تو صحرا دیکھوں ۸۷
☆......زمین تال پہ قدموں کی گنگناتی ہے ۸۸
☆......آج یاروں نے جو کی انجمن آرائی بہت ۸۹
☆......نہ ابتدا نہ کوئی انتہا سفر میں ہوں ۹۰

☆......حرف کو لمحوں کے سینے میں اتارا جائے ۹۱
☆......نوک نشتر پہ تُل رہے ہیں خواب ۹۲
☆......جانے کیا تاریکیوں نے راستوں سے کہہ دیا ۹۳
☆......میں رہگذر کے کنارے کی بندشیں توڑ دوں ۹۴
☆......دریا ہوں اپنی موج میں زندہ ہوں دوستو ۹۵
☆......ملکیت ۹۶
☆......سورج کا بدن لئے ہوں ۹۸
☆......زندہ رہنے کے لئے پیتا رہتا تھا لہو ۹۹
☆......ہو کے حیران بہت شوخی جاں ٹھہر گئی ۱۰۰
☆......وہ جو محنت کی طرف میرا رویہ ہوگا ۱۰۱
☆......کتنے موسم آئے گئے ہیں یاد تو کرلیں ۱۰۲
☆......سارا دریا بھی دریا ہے اک لہر بھی دریا ہے ۱۰۳
☆......مکھیا نے وہ نیم کا پیڑ ہی کٹوا ڈالا ۱۰۴
☆......جانے کب لوٹوں پھر ادھر کو ۱۰۵
☆......اس عہد کی سچائی کی مہر جب ان پہ نہیں تو کچھ بھی نہیں ۱۰۶
☆......سمٹے ہوئے اعصاب بکھر نہ جاتے ۱۰۷
☆......ہر قدم دل میں نئے زخم کا ہوتا ہے پڑاؤ ۱۰۸
☆......دل بھی معصوم ہے بچوں کی طرح ۱۰۹
☆......پھر کوئی قیس سرِ راہگذر آتا ہے ۱۱۰
☆......اک کلو خربوزے لے کر سو کا نوٹ بھُنایا تھا ۱۱۱

☆......جھوٹ ایسا کہ جو سچ بھی نہ چھپانا چاہے ۱۱۲
☆......میں خود سے سوال کر رہا ہوں ۱۱۳
☆......قریہ جاں میں پلٹنے کی کوئی راہ نہیں ۱۱۴
☆......دہلیز پہ راتوں کی اک جلتا دیا رکھنا ۱۱۵
☆......وہ ایک ہنگامہ رنداں جو خرابات میں ہے ۱۱۶
☆......عکس قائم اگر نہیں ہوتا ۱۱۷
☆......بے سائباں بستی کے گھر بولنے لگے ۱۱۹
☆......نہ بزم مے نہ در میکدہ نہ گردشِ جام ۱۲۱
☆......آندھیوں نے جو چلائے پتھر ۱۲۳
☆......اک اور شخص اپنے لہو میں اتر گیا ۱۲۵
☆......چوکیدار ۱۲۶
☆......دھوپ جب زاویے بدلتی ہے ۱۲۹
☆......ہنسی میں سادہ دلی ہے نہ آنسوؤں میں خلوص ۱۳۰
☆......ان بارشوں کا پانی تو پی جائے گی ۱۳۱
☆......مدت سے مرے لب پہ تیرا نام نہ آیا ۱۳۲
☆......تھا بادبان سے زیادہ بھروسہ مجھے جس پر ۱۳۳
☆......تنہائی ۱۳۴
☆......یوم مئی ۱۳۵
☆......فلسطین ۱۳۸
☆......اک ساعت کسی بھیگی ہوئی شب کی ساعت ۱۳۹

☆......نہ دل کی دیت کوئی نہ کوئی جنوں کا صلہ ۱۴۰
☆......اے شہرِ دل آرام ۱۴۱
☆......بے نور سمندر میں ہے گھر سائے کا ۱۴۲
☆......جنہیں صبح تک تھا جلنا سرِ شام بجھ گئے ہیں ۱۴۳
☆......زمانہ ہو کہ نہ ہو ساز گار کچھ بھی نہیں ۱۴۴
☆......بستی کا شب کا سناٹا جھوٹا ہے ۱۴۵
☆......بیت گئیں ساری ہی رتیں اک موسم زرد تھا ۱۴۶
☆......ایک نظم ۴ اپریل کے نام ۱۴۷
☆......شہید ۱۴۸
☆......مانوس ہے یہ شہر ترا ہم سے کچھ ایسا ۱۴۹
☆......بلند رکھنا شہیدوں کی آبرو کے چراغ ۱۵۰
☆......۱۳ نومبر ۱۵۱
☆......تیری یادوں سے دیوار و در ضوفشاں ۱۵۳
☆......فیض احمد فیض ۱۵۴
☆......دل کی اداسیوں سے کوئی باخبر نہ تھا ۱۵۵
☆......۳۱ دسمبر ۱۵۶
☆......ہم نے پہیوں کو رمِ آبِ رواں بخشا ہے ۱۵۸
☆...... انگ انگ سے نغمے جاگیں ۱۶۰
☆......اسکول کو جاتی ہوئی بچوں کی قطاریں ۱۶۲
☆......گر آج ساقی تہی دست ہے تو کیا غم ہے ۱۶۴

☆......جل تھل کرنے والا بادل ایک اک بوند برستا ہے ۱۶۵
☆......قامت سے نہیں ہے نسبت ان کو ۱۶۶
☆......شہر میں کوئی نہیں، شہرِ خموشاں کے سوا ۱۶۷
☆......منزل کے تعین کے لیے ہم نے سفر میں ۱۶۹
☆......شہرِ داغِ زرگل ۱۷۰
☆......ساقی نہ رہا لطف و کرم کون کرے گا ۱۷۲
☆......ازل ہے نہ ابد ہے اک سفر ہے ۱۷۳
☆......کیا کام دیں گی میری ستارہ شناسیاں ۱۷۴
☆......گو کم نہیں ہونے کا جو آزار بہت ہے ۱۷۵
☆......ٹوٹے گی یا کوئی نئی زنجیر بنے گی ۱۷۶
☆......دلوں پہ رسم تقاضائے دلبری کے لیے ۱۷۷
☆......ہوا کے ہاتھ میں بے دست و پا ہے ۱۷۸
☆......اک دھڑکتا ہوا دل لے کے چلے آئے ہو ۱۷۹
☆......آستین پہ کوئی دھبہ ہے نہ دامن پہ ہے داغ ۱۸۰
☆......حسن اگر آہنگ محض ہے پھر کیوں اچھا لگتا ہے ۱۸۲
☆......اپنے گھر کے آگے سے اس طرح سے گذرے ہم ۱۸۳
☆......اک عمر بعد بھی ہمیں راحت نہیں ملی ۱۸۴
☆......زخم کی پرسش تم نہ کرنا ۱۸۵
☆......رشتوں میں گرمی نہ ہو تو پھر گھر سے بازار بھلا ۱۸۶
☆......کچھ عہد وفا کے رشتے تھے کچھ ترکِ وفا کے ناتے تھے ۱۸۷

☆......آتی ہے یاد آتشِ ورخسار ولب کی لو ۱۸۸
☆......چاک دل لے چلے چشم تر لے چلے ۱۸۹
☆......جب تلک دوستو ہجر کی شام ہے ۱۹۰
☆......تھی فکر روزگار جو فکر وصال ہے ۱۹۱
☆......شب فراق ہے امید صبح وصل کے ساتھ ۱۹۲
☆......حسن ترتیب ہے اجزائے بہاراں کے بیچ ۱۹۳
☆......تھمتا نہیں پیمانہ کبھی گردش مے سے ۱۹۴
☆......نہ ذہن یکسو نہ دل کو قرار رکھتے ہیں ۱۹۶
☆......ہم بہت دل اداس رکھتے ہیں ۱۹۷
☆......صرف آرائش گلشن میں لہو ہونا ہے ۱۹۸

☆......☆

میرا بچہ
جو دنیا میں
آج ہی آیا ہے
توپوں کی گھن گرج سے ڈر کر
سہم گیا ہے
اپنے جنگی نعرے اور بموں کے
دھماکے
بند کرو
میں اس کی آوازیں سننا چاہتا ہوں

1974

تین شعر

سنگریزوں سے محبت کے ترانے مانگے
دل تو دیوانہ ہے جینے کے بہانے مانگے

یا وہ صدیاں تھیں جو لمحوں میں گزر جاتی تھیں
یا وہ لمحہ ہے جو صدیوں کے زمانے مانگے

ذہن کے کربِ مسلسل سے عبارت ہے فن
ہر نیا شعر کئی زخم پرانے مانگے

☆☆

دل کی تسکین ڈھونڈنے نکلے اور پھرے ناکام بہت
ہم پر ہی بربادی دل کے پھر آئے الزام بہت

خالی دامن چاک گریباں خاک اڑاتے پھرتے ہیں
جب سے تیرا ساتھ چھٹا ہے ہم ہیں بے آرام بہت

O

تیری آس پہ زندہ ہیں ہم جانِ جاں آواز تو دے
دل تنہا اور ہو کا عالم، جانِ جاں آواز تو دے

شورِ طلب ہے دل کا عالم، جانِ جاں آواز تو دے
یادیں زخم اور یادیں مرہم جانِ جاں آواز تو دے

سناٹا تو ٹوٹے گا یہ ویرانی تو جائے گی
ہنس دیں ہم یا آنکھ ہو پرنم، جانِ جاں آواز تو دے

تیرے پیار کی لذت بھولی تیرے جسم کی قربت بھولی
دل ہے اب گم گشتہ عالم، جانِ جاں آواز تو دے

یادوں کے آنگن میں ہیرے جیسے دیپک جلتے ہیں
جگمگ جگمگ مدھم مدھم جانِ جاں آواز تو دے

○

بنجاروں سے پیار کرو گے آخر میں پچھتاؤ گے
بستی بستی ڈھونڈ پھرو گے ان کا پتہ نہ پاؤ گے

ساتھ رہے تو پیارا ہے جو چھوٹ گیا سو چھوٹ گیا
کب تک دل کو مار رہو گے جھوٹی پریت نباہو گے

من کا دکھ اور تن کی لذت سونپ چلے ہو نسلوں کو
من بھی باقی تن بھی زندہ تم کیسے مرجاؤ گے

آنسو موتی بن جاتے ہیں موت امر ہوجاتی ہے
ایسی کوئی راہ نہیں ہے جہاں سے راہ نہ پاؤ گے

گھور اندھیرا پھیلا ہو تو روشنی ہیں آوازیں بھی
گونج بڑھے گی قدموں کی تم گیت سناتے جاؤ گے

دیپ جلاؤ آندھی میں پھر بجھتے ہیں تو بجھنے دو
تھوڑی راہ تو روشن ہوگی تھوڑی دور تو جاؤ گے

جیل سے لکھی گئی ایک نظم

رشتے

جیل کی تنگ وتاریک کھولی میں بند ہو کے میں
یہ تو ممکن ہے کہ
اپنی بیوی کے عارض کو، زلفوں کو چھو نہ سکوں
اپنی آغوش میں اپنے بچوں کو لے نہ سکوں
ماں کی آنکھیں مجھے دیکھنے کے لئے منتظر ہی رہیں
ایسے رشتے جو میرے لہو سے بنیں
ٹوٹ سکتے ہیں
یہ بھی ممکن ہے کہ ٹوٹ جائیں مگر
ایسے رشتے جو میرے ضمیر اور میری روح سے تابندہ ہیں
جو مری جان سے مربوط ہیں
ٹوٹ سکتے نہیں
اور بھی مضبوط ہو جائیں گے
میرے جرم وفا کا صلہ
میرے ہاتھوں میں بجتی ہوئی ہتھکڑی کی صدا
ایسی گونجی کہ مظلوم قوموں کی حرفِ دعا بن گئی
دہشت وخوف کے دور میں جراتوں کی صدا بن گئی
میرے ہاتھوں میں بجتی ہوئی ہتھکڑی کی صدا

سائیگاؤں میں ایک شخص کی ہتھکڑی کی صدا سے ملی
ایک جھنکار بن کر اٹھی
جب بہت دور افریقہ میں
اک محبّ وطن پیر میں بیڑیاں ڈالے سڑکوں پہ کھینچا گیا
میرے ہاتھوں سے ان دیکھے رشتوں میں مربوط ہیں
ہاتھ جو طالب علموں کے ہیں
ہاتھ جو ملک بھر کے کسانوں کے، محنت کشوں کے ہیں جو پوری انسانیت کی بقا کیلئے لڑتے ہیں
ہاتھ جو ماؤں کی مامتا بہنوں کا پیار ہیں
ہاتھ جو حُسن ہیں، عشق ہیں، شوق دیدار ہیں
میرے ہاتھوں سے ان دیکھے رشتوں میں مربوط ہیں
میری آواز تم نے یہاں بھی سنی
میری آواز ایران کی قتل گاہوں میں ہے
میری آواز ترکی کے زندان میں ہے
میری آواز ویتنام و بنگال ہے
کوریا میری آواز کا نام ہے
ظالمو گونج سے جس کی دہشت زدہ ہو تم وہ میری آواز ہے
ظالمو کا مقدر فنا

میرے رشتوں کی تقدیر عہد بقا
جاوداں، بیکراں
ہاتھ زندہ ہیں، آوازیں پائندہ ہیں

ممکن نہیں کہ جرأتِ اظہار چھین لو
ہم سے ہمارے عشق کا آزار چھین لو

دل سے خیال حسنِ طرحدار چھین لو
سانسوں سے خوشبو زلف سے مہکار چھین لو

یادوں کے جگمگاتے ستارے بجھا سکو
ہاتھوں سے لمحے لمحوں سے رفتار چھین لو

قندیل شب ستارۂ صبح بشر ہیں ہم
روشن ہے اپنی طبعِ بیدار چھین لو

چلتی ہوئی نسیم میں پھولوں کا پیار ہے
چلتی ہوئی نسیم سے یہ پیار چھین لو

رگ رگ سے اس جمال کا افسوں نکال دو
مے سے نشاط حسنِ غمِ یار چھین لو

ممکن نہیں کہ جراتِ اظہار چھین لو
ہم سے ہمارے عشق کا آزار چھین لو

○

دیار شعلہ رقصاں ہے یاں سنبھل کے چلو
ہر ایک ذرہ ہے برقِ تپاں سنبھل کے چلو

سنبھلنے کے بھی ہیں معیار مختلف یارو
جنوں سفر کا ہے نگراں یہاں سنبھل کے چلو

نشیب وادی میں رقصاں سرابِ لعل و گہر
بھٹک گئے جو ہوئے بدگماں سنبھل کے چلو

کبھی انیس شب غم ہے دل کی تنہائی
کبھی ہے زیرِ قدم کہکشاں سنبھل کے چلو

یہ عزمِ راہزنی آڑ میں کمین گاہ کی
بہت سے دوست ملیں گے یہاں سنبھل کے چلو

قریب و دور کبھی اس کی خوشبوئیں پھیلیں
کبھی وہ لہر گریزاں یہاں سنبھل کے چلو

ہر اک سمت میں اوہام کے ہیولے ہیں
خفا ہیں بت یا خدا مہرباں سنبھل کے چلو

ہوائیں گاتی ہیں ان راستوں پہ وہ نغمہ
لہو اگلنے لگے تارِ جاں سنبھل کے چلو

جھلستی تپتی ہوئی دھوپ کا تو ذکر ہی کیا
خود اپنا سایہ نہیں مہرباں سنبھل کے چلو

تین شعر

دکھ اتنے لگ گئے ہیں مری زندگی کے ساتھ
آئی کبھی ہنسی بھی تو شرمندگی کے ساتھ

کیا خوب تیرگی سے اُجالے میں لائے تم
آنکھیں بھی میری کھو گئیں اس روشنی کے ساتھ

ساری جبیں پہ سجدوں کے گٹے پڑے ہوئے
کیا خوب ہو رہا ہے یہاں آدمی کے ساتھ

پتھر مارنے والوں مبارک، آج دوانہ مر ہی گیا
زخم اٹھاتا تھا اپنوں کے، وہ بیگانہ مر ہی گیا

جس نے تم کو غیر نہ جانا جس کو تم نے اپنا نہ مانا
اک چہرہ جو پھرتا تھا کم کم پہچانا مر ہی گیا

بھوکے بچے دن بھر بہلے سنگباری کو کھیل سمجھ کر
جس نے انہیں بہلائے رکھا وہ دیوانہ مر ہی گیا

جھوٹی محبت کے رشتے تم سارے جگ سے نباہتے ہو
وہ جو جھوٹی نفرت کا بنتا تھا نشانہ مر ہی گیا

کیسے کیسے لعل و جواہر تم نے اس کی جھولی میں ڈالے
طعن و تشنیع طنز و ملامت اپنا بیگانہ مر ہی گیا

شہر کی گلیوں اور کوچوں پر جانے اب کیا گذرے گی
شہر کی رونق اپنے آپ میں اک ویرانہ مر ہی گیا

بڑے عذاب ہیں انساں کو آگہی کے لئے
ہے ظلمتوں میں سفر شرط روشنی کے لئے

ہمارے بعد نہ دستِ ستم کسی پہ اٹھے
الجھنا لازم ہے قاتل سے زندگی کے لئے

خداؤ ہم پہ نہ ڈالو یہ کبریائی کا بوجھ
کہ خاکساری بھی مشکل ہے آدمی کے لئے

بجھانے نکلے ہیں جن کو نظر نہیں آتا
کہاں کہاں دئے جلتے ہیں روشنی کے لئے

☆☆

لعنت ہے ایک نشاط ہوس کار اقتدار
اے کاش آدمی کے برابر ہو آدمی

○

اے راہروانِ مقتلِ جاں یہ بات سمجھنا لازم ہے
گر دستِ ستم کو روکنا ہے قاتل سے الجھنا لازم ہے

کعبہ سے کلیسا سے آگے جو اس کے در تک جاتی ہے
جس راہ سے بھی آؤ یارو اس راہ سے گذرنا لازم ہے

یہ مسلکِ عہد جوانی ہے تفسیر کتابِ ہستی ہے
جینے کی تمنا لازم ہے اس شوخ پہ مرنا لازم ہے

اے اہلِ قلم اے اہلِ زباں کیا اس کے سوا ہے مصرفِ جاں
جب حرمت حرف ولب پہ بنے تب جاں سے گزرنا لازم ہے

ہم اپنے لہو کی اڑتی چھینٹوں کے انجام سے واقف ہیں
جب تارے ڈوبنے لگتے ہیں سورج کا ابھرنا لازم ہے

1976

بلوچستان

سیہ خانہ ایام میں لہو پہنے
کھڑا ہوا ہوں سرِ رہگذار جانے کب
نگارِ صبح کی جانب سے آئے حکمِ طلب

کھڑا ہوا ہوں سرِ رہگذار کہ میں نے
ہزار صدیاں گزاری ہیں دشتِ ظلمت کی
کھلی جو آنکھ تو کوڑوں کے زخم کھائے ہیں
نظر اٹھائی تو پہلو پہ نیزے آئے ہیں
سپہِ شب خون کی یلغار میں گھرا ہوں میں
مرا گناہ یہی ہے مجھے گوارہ نہیں
کہ میری دھرتی کے ساحل پہ قتل گاہیں بنیں
ذخیرے گولہ و بارود کے جمع ہوں جنہیں
کرائے کے قاتل
مرے گھروں کو جلانے میں استعمال کریں
مجھے قبول نہیں ہے فریب راہزناں
سرنگیں راستے تعمیر ہو رہے ہیں یہاں

کہ جب کرائے کے قاتل تلاش میں نکلیں
نہ کوئی بستی نہ بنجر پہاڑ نہ صحرا
مجھے کہیں نہ اماں ہو مجھے پناہ نہ ملے
مجھے قبول نہیں کہ تمہارے چہرے کی
سیاہیوں کا کوئی عکس اس زمین پر پڑے
مجھے قبول ہے کہ ہولناک بم برسیں
شبِ سیاہ میں بستی کا چہرہ جلتا ہو
گلی گلی در و دیوار سینہ چھلنی کیئے
کھڑے ہوں نوحہ کناں
مگر غلامیِ اہلِ ستم قبول نہیں

میں انتظار میں
یہ انتظار مرے خونِ دل کا پھل ہے جسے
مشقتوں نے سرِ رہگذر اگایا ہے
کھڑا ہوا ہوں سرِ رہگذار جانے کب
نگارِ صبح کی جانب سے آئے حکمِ طلب

ذوقِ طلب انساں کا حریف — دل ٹھیرا ہے جاں کا حریف
بات یہاں پر ٹھیری ہے — دیوانہ زنداں کا حریف
اس کا حُسن ہے دشمنِ جاں — کعبہ ہے ایماں کا حریف
اپنی تمنا پر حیراں — میں دشتِ امکاں کا حریف
مفت لگادی جان ہم نے — ہے کوئی اب جاں کا حریف

1977

اک پل کے لئے لہرا کے گرا
کوئی پتہ
کوئی لمحہ
کوئی بازو
کوئی سر
درد کی لہر بڑھی
روشنی تیز ہوئی
ذہن در ذہن سفر کرتی ہوئی
شہر در شہر گئی
شبِ ظلمات سے ٹکرانے کی
ایک پل کے لئے طوفان میں لہرانے کی بیباک ادا
وقت کی آن بنی
تری پہچان بنی
وقت اے وقت ترا نام حسن ناصر ہے

20-11-77

○

حریمِ حسن میں دل کا وقار باقی رہے
یہ جاں رہے نہ رہے اعتبار باقی رہے

وہ رنگ اب کے دکھائے چمن فروشوں نے
نہ ہم رہے نہ گلِ نو بہار باقی رہے

ہر ایک بات پہ پھرتے ہو اپنی بات سے تم
کچھ ایسی بات کرو اعتبار باقی رہے

ترا غرور رقیبوں کی خو بہار کے رنگ
مرے جنوں سے سبھی روزگار باقی رہے

عیاں ہو لالہ و گل سے یا آنکھ سے ہو رواں
لہو میں پرتوِ روئے نگار باقی رہے

○

سونا رستہ دور سویرا دیئے جلائے رکھنا
آج کی شب ہے بہت اندھیرا دیئے جلائے رکھنا

پل کے پل میں کس کو خبر ہے کیا سے کیا ہو جائے
چاروں جانب ٹھگوں کا ڈیرا دیئے جلائے رکھنا

ذکر نہیں ہے راہزنوں کا ڈر ہے محافظ لوٹ نہ لیں
تیرا میرا رین بسیرا دیئے جلائے رکھنا

تیرے ملن کی آس لئے دور نگر سے آئے گا
لوٹ نہ جائے راہی تیرا دیئے جلائے رکھنا

دل کے دریچے بند نہ کرنا روشن رکھنا پلکیں
زلفوں کا سایہ ہو گھنیرا دیئے جلائے رکھنا

نینوں والی آس نہ ٹوٹے تیری آنگن آنگن
جب تک نہ ہو چاند کا پھیرا دیئے جلائے رکھنا

19-12-77

○

میں اپنے خیمہ میں شب گزیدہ
عتابِ امروز کا نشانہ
تلاش کرتا ہوں جرم اپنے
کہ جنکی پاداش میں وطن سے
نکل کے میں دربدر ہوا ہوں
تمام دن کی مشقتیں ہیں
جھلستے صحرا میں نفرتیں ہیں
حصارِ جاں حلقۂ نظر ہے
تمام شب درد کا سفر ہے
تمام یادیں تمام آنسو
محبتوں کے سلام آنسو
لہولہو جذب ہو رہے ہیں
اک اجنبی دیس کی زمین میں
جہاں مرا کوئی حق نہیں ہے
عمارتیں جو مری نہیں ہیں
مری جوانی کے سارے لمحوں کو
ایک اک کر کے پی رہی ہیں
میں غیر کے شب کدے سجا کر

خود اپنی شمعیں بجھا رہا ہوں
وصول کرنے کو چند درہم
میں اپنی سانسیں لٹا رہا ہوں
غلام ہوں اجنبی زمیں پر
جو چند سکوں میں بک گیا ہے
یہ چند سکے بہت گراں ہیں
مرے وطن میں یہ بے نشاں ہیں
میں سوچتا ہوں یہ کیا ہوا ہے
کہ میرا گھر میرا گھر نہیں ہے
قرار جاں اور مجھ میں حائل
حصول زر کی شہر پناہ ہے
وہ کون تھا جس نے ڈاکہ ڈالا ہے
میری شاداب وادیوں پر
مرے لہو کی تمازتوں پر
وہ کون تھا جس نے ڈاکہ ڈالا ہے
روزگار و رفاقتوں پر
اور ایک اجنبی زمین پر
نگاہ کی ٹھوکروں کی زد میں
لہو اگلتے تپیدہ جسموں کو
بے وطن در بدر کیا ہے

22-12-77

۲ جنوری ۱۹۷۸ء

گولیاں چاٹ گئیں سینہ فگاروں کے بدن
نوکِ سنگیں سے دریدہ ہیں دلوں کے دامن

جم گیا مل کے احاطے میں شرر بار لہو
در و دیوار لہو کوچہ و بازار لہو

اک زردار کے ماتھے پر شکن آتی ہے
شہر میں ساٹھ جنازوں کو سجا جاتی ہے

منتظر باپ کا چوکھٹ پہ ہے کوئی معصوم
تازہ قبروں پہ ہے بے آسرا لوگوں کا ہجوم

آج کی رات کسی گھر میں دیا جلتا نہیں
ایسی دہشت ہے کہ بستی کا پتہ چلتا نہیں

تعزیت دیجیے ملتان کے ویرانوں کو
ظلم نے پھونک دیا ہے یہاں انسانوں کو

نوٹ: 2 جنوری 1978ء کو جنرل ضیاالحق کے دور میں ملتان کالونی ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں کا قتل عام ہوا۔

ترنم عزیز

بارِ الٰہا
اس بچی کا جرم ہے کیا
جس کو اپنی بات بھی کہنی نہ آتی تھی
جس کی آنکھوں کی حیرانی
پل پل بڑھتی جاتی تھی
بارالٰہا
اس کو چند درندوں نے
بوٹی بوٹی کچل دیا تھا
بارِ الٰہا
تو کیوں چپ تھا

☆☆

خدایا بچی کو قتل ہوتے تو نے دیکھا تھا
جو خلق پوچھے گی تیرا جواب کیا ہوگا

نوٹ: 11 فروری 1978 کو ایک آٹھ سالہ بچی ترنم عزیز کو اس کے والد کے ڈرائیور نے اغوا کرلیا اور اگلے دن یوسف پلازہ فیڈرل بی ایریا کے پیچھے سے اس بچی کی لاش ملی ڈاکٹرز کے مطابق اس سے زیادتی کرنے کے بعد اس کا گلا گھونٹ کر مار دیا گیا تھا۔

○

شام ہوئی اور کھل گیا موسم
اس کی آنکھوں سے مل گیا موسم

نذر جاں دے رہے ہیں تشنہ لب
کیوں کہیں ہم خجل گیا موسم

فرصتِ یک نظر سے بیش نہیں
جیسے جاتا ہے دل گیا موسم

زخم سے پیرہن چپکتا ہے
جیسے یادوں سے سل گیا موسم

☆☆

ہم کشتی جو ساتھ ہمارے وہ کشتی
جو اسکے ساتھ ہوگئے سب بے گناہ ہیں

پٹ فیڈر

ہم پٹ فیڈر کے جیالے ہیں
ہم لو اور دھوپ کے پالے ہیں
اس دھرتی کے رکھوالے ہیں
ہم سرخ پھریرے والے ہیں

وادی کی سندرتا اپنی ہے
پربت کا مان ہمارا ہے
کھیتوں کی خوشبو اپنی ہے
اونچا کھلیان ہمارا ہے

ہم دھرتی کے متوالے ہیں
ہم پٹ فیڈر کے جیالے ہیں

کیا ظلم وڈیرہ شاہی کے
کیا فوج پولیس کی دلالی
کیا غنڈہ گردی بدمعاشی
کیا بے دخلی کیا بدحالی

ہرظلم سے لڑنے والے ہیں
ہم پٹ فیڈر کے جیالے ہیں

پرچم جگ کے مظلوموں کا
ہم کو بھی راہ دکھاتا ہے
نعرے سانسیں آواز قدم
طوفاں میں سب ڈھل جاتا ہے

ہم طوفانوں کے پالے ہیں
ہم پٹ فیڈر کے جیالے ہیں

یہ سندھ کے بیٹے بیٹیاں ہیں
پنجاب کے جیالے ساتھ میں ہیں
اس دیس کے کونے کونے سے
سب ہاتھ ہمارے ہاتھ میں ہیں

سب مل کر لڑنے والے ہیں
ہم پٹ فیڈر کے جیالے ہیں

کھیتوں سے گوٹھ سے گاؤں سے
گلیوں سے پلوں کی راہوں سے
اسکولوں کی ٹھنڈی چھاؤں سے
آنچل سے مہکتی بانہوں سے

سب آکر ملنے والے ہیں
ہم پٹ فیڈر کے جیالے ہیں

نوٹ: 22 دسمبر 1978 کو پٹ فیڈر، بلوچستان میں کسانوں کا قتل عام کیا گیا۔

۱۳ نومبر

میرا ساتھی وہ مرا دوست مرا راہنما
کاش وہ آج بھی زندہ ہوتا
آج جب اس کے یقیں کی شمعیں
ہر دریچہ میں ضیاء دیتی ہیں
اس کی آنکھوں کی نئے عہد کی سچائی کا عکس
در و دیوار سے بول اٹھتا ہے
آج جب اس کی صدا
گونج بن کے گلی کوچوں سے ابھر آئی ہے
کاش وہ آج بھی زندہ ہوتا
میرا ساتھی وہ مرا دوست مرا راہنما

18-9-78

☆☆

مقتلِ حرف میں
نطق و لب کے لہو میں نہائے بنا
بازیِ عشق میں
بارِ سنگِ ملامت اٹھائے بنا
کون ایسا ہے جو ذی شرف ہو گیا

اندازِ سخن اور ۷۲ کلیاتِ شاہد رضوی

○

قبائے زخم دلِ ناتواں پہ سجتی ہے
یہ تازگی تو اسی نیم جاں پہ سجتی ہے

بہت حسین ہے یہ چاندنی مگر اے دوست
یہ چاندنی تو اک آرامِ جاں پہ سجتی ہے

یزیدِ عصر نظامِ ستم کی خیر منا
یہ قتل گاہ مرے کارواں پہ سجتی ہے

ہمارا نام شہیدانِ کج کلاہ میں ہے
ہماری آن صلیبِ گراں پہ سجتی ہے

20-9-78

☆☆

حاکم کو رعایا کی خوشحالی کا پتہ دو
چولھے نہیں جلتے ہیں اگر گھر کو جلا دو

یعقوب کھوکھر

کہیں شعلوں کی کہیں خونِ رواں کی تحریر
شہر ہے دیدہ خونابہ فشاں کی تحریر

کتنی خوش رنگ تھی دلسوزی سے جاں سوزی تک
کتنی گہری تھی مرے یارِ جواں کی تحریر

کوئی انجم کوئی مہتاب نہ ایسے چمکا
جیسے روشن رہی اس شعلۂ جاں کی تحریر

کتنی بے آبرو ہے بارشِ سنگ و دشنام
سربلند کتنی ہے سوز غمِ جاں کی تحریر

حاکمِ شہر کبھی ایسے نہ دیکھی ہوگی
قلبِ آزاد کی بے خوفِ زباں کی تحریر

4-10-78

☆☆

جانے کس سمت سے آتی ہے ہوا
اپنے ہی خون کی بو آتی ہے

تین شعر

ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا الجھا ہوا ہے چاند
تقسیم سلاخوں میں ہیں آزار یہاں کے

اوروں کو بھی لائی تھی ہماری سی ہی وحشت
مانوس ہیں ہم سے در و دیوار یہاں کے

ظلمت وہی تنہائی وہی درد وہی ہے
بکھرے ہوئے ہیں شہر میں آثار یہاں کے

حسن ناصر

اک دیئے کی جوت سے ٹوٹا اندھیاروں کا دل
ایک ہوا کی لہر چلے لے جائے دل بادل
ایک ذرا سا کنکر ساری ندیا میں ہل چل
آس ہے آنے والے کل کی آج کا اک اک پل

ایک آواز امر شہید کی گونجے صدیوں سال
ایک لہو کی بوند گرے تو دھرتی ساری لال

قرضِ عہدِ وفا چل آج چکا دیں اے دل
عمر بھر سے جو کمایا ہے لٹا دیں اے دل

تجھ میں اک بوند لہو کی تو ابھی باقی ہے
کوچۂ یار کو گلنار بنا دیں اے دل

جانے کس روز صبا پھول کھلاتی گزرے
اک نئی آس دریچوں پہ سجا دیں اے دل

کوئی آئے کہ نہ آئے سرِ راہ روشن ہو
ایک چراغ اور امیدوں کا جلا دیں اے دل

پھر نظر آئے وہ ہی چہرۂ زیبا اے کاش
پھر اسی دشتِ محبت میں صدا دیں اے دل

اتنے آزردہ ہوئے ہیں کہ یہ جی چاہتا ہے
دشت دنیا میں کہیں خود کو گنوا دیں اے دل

9-10-78

اے نگارِ وطن
کھیل سمجھے ہوئے ہیں ترے عشق میں
رسمِ دار و رسن
جانِ سوزاں کا فن
کتنے خوں گشتہ خورشید بنتے رہے
شاہراہوں پہ نقشِ گل و یاسمن
کتنے مہتاب زنداں کی تنہائی میں
نور دیتے رہے داغ چنتے رہے
فرشِ زنداں میں دفن ہو گئے بے کفن
رات بھر ہم پہ شب خون آتے رہے
ہم کمین گاہ سے تیر کھاتے رہے
تیرگی
تہہ بہ تہہ جم گئی
روشنی راہ میں تھم گئی
پشت کوڑوں کی زد میں بلکنے لگی

خیمہ جاں سرِ شام جلنے لگے
اہلِ کوفہ کی نسل حکمراں ہوگئی
اور میرا وطن کربلا بن گیا

اے نگارِ وطن
کھیل سمجھے ہوئے ہیں ترے عشق میں
رسم دار و رسن
جانِ سوزاں کا فن
آج پھر ہم ہیں اور قتل گاہِ وفا
پھر طلب کرتے ہیں جان و دل کا صلہ
کوٹ لکھپت ہو یا شہر کی شاہراہ
زندہ باد عشق اور عشق کا بانکپن
اے نگارِ وطن

11-11-78

○

دلِ برباد کی تصویر سی بن جاتی ہے
دشتِ وحشت میں یونہی خاک اڑائے رکھنا

آج نہ آیا تو کل آئے گا آنے والا
کہکشاں اپنی نگاہوں میں سجائے رکھنا

بجھ نہ جائے وہ الاؤ کہ ہے سرمایۂ شب
جسم جل جانے دو شعلوں کو جگائے رکھنا

لوگ معیارِ سزا سے ہمیں پہچانتے ہیں
ہم گنہ گاروں کی توقیر بڑھائے رکھنا

☆☆

قتل گہ سے ہر اک آواز ہمیں آتی ہے
ہم تو منصور ہیں ہم پر ہر اک الزام سجا

☆☆

بکھرے ہوئے جو ریت کے صحرا کی طرح ہیں
اٹھ جائیں تو چھا جائیں گے آندھی کی طرح ہم

ان مقامات پہ ہم راہ میں اکثر ٹھیرے
ہم سے پہلے جہاں لوگ آ کے پیمبر ٹھیرے

منتخب اہلِ وفا میں ہیں ستم آشنا ہم
زخم وہ سہتے ہیں جو دل کے برابر ٹھیرے

یہ وہ بازی ہے جہاں مات نہیں ہے ہم کو
مر بھی جائیں گے تو ناصر کے برابر ٹھیرے

رہزنوں تم سے بھی منزل سے بھی ہم واقف ہیں
ہم بھی کچھ سوچ کے اس منزلِ جاں پر ٹھیرے

کیا خبر کون سے لمحے میں اٹھا دیں طوفاں
ہم تو یوں ٹھیرے ہیں جیسے کہ سمندر ٹھیرے

25-12-78

1979

سالگرہ

اک شمع اور جلی عمرِ رواں اور بڑھی
رنگِ مے تیز ہوا شوخیِ جاں اور بڑھی

پھر ہر اک سمت امیدوں کا اجالا ہوگا
دردمندوں کا کوئی چاہنے والا ہوگا

تیری تصویر کا آواز کا افکار کا رنگ
بزمِ جمہور کے جاگے ہوئے کردار کا رنگ

ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تیری سالگرہ
سینۂ ظلم میں نصب ہوگئی نیزے کی طرح

کون اب حوصلۂ عرضِ ستم چھینے گا
کون اب ہم سے وفاؤں کا علم چھینے گا

نوٹ: ذوالفقار علی بھٹو کی سالگرہ

دشتِ شب کو ترا حرفِ جنوں کاٹ گیا
تو وہ ہیرا کہ اندھیروں کا جگر چاٹ گیا

کنجِ زنداں میں ہو یا مجمعِ یاراں میں رہے
اہلِ دل کے لئے تو حوصلۂ جاں میں رہے

4-1-79

تین شعر

تجھ سے چھو کر کے میرا سارا گھر
تیری خوشبو میں بھیگ جاتا ہے

ایک مانوس اجنبی کی طرح
لمحہ رکتا ہے گزر جاتا ہے

بے حساب اور بے گماں پانی
جانے دریا کہاں سے آتا ہے

○

آج پھر اپنے دکھوں سے میں پشیمان پھرا
نہ کوئی حرفِ تسلی نہ کوئی دستِ دعا

دل یہ کہتا ہے کہاں جائیں مسیحا نہ خدا
درد کہتا ہے یہ دل آج سرافراز ہوا

پھر وہی میں وہی ویرانی شب کی سوغات
خاک کے ذروں کی مانند بکھرتی ہوئی رات

کوئی ساعت نہ رہے کوئی ملاقات نہ ہو
کل کی شام آئے تو جو آج ہے وہ بات نہ ہو

دل کے احساس کو زخموں کی زباں ملتی ہے
ورنہ اس بستی میں آواز کہاں ملتی ہے

پھر مرے پہلو میں درآئی اندھیرے کی صلیب
مرگ بے مایہ مری جرأت و عظمت کا نصیب

کس کے سر جائے گا الزامِ وفا میرے بعد
کس کو ہوگا دلِ وحشی سے گلہ میرے بعد

تین شعر

دل کے لہو سے قصہ جاں جا بجا لکھیں
اک بے وفا کے نام پہ حرفِ وفا لکھیں

برسوں سے چاند نکلا نہ دستک کوئی ملی
ہم بام و در سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا لکھیں

سوئے ہوئے ہیں شہر کے احساس دوستو
کس کے لیے حکایتِ درد آشنا لکھیں

○

نہ قتیل دردِ وفا کوئی نہ نثار عارض و لب کوئی
ترے جاں نثار کدھر گئے ترے غم گساروں کو کیا ہوا

ترے کوچہ و بام کی رونقیں سرِ شام سے ہیں بجھی ہوئی
جنہیں چاکِ زخم پہ ناز تھا ترے شہر یاروں کو کیا ہوا

وہ جو رہن رکھتے تھے جان و دل وہ جو رنگِ مے تھے اچھالتے
ترے میکدہ کے بلاکشاں ترے میگساروں کو کیا ہوا

وہ جنوں کے سارے ہنر لئے کڑی منزلوں سے گذر گئے
وہ قبیلہ درد کے کشتگاں ترے دلفگاروں کو کیا ہوا

○

کیا کیجیے وضع جیب و گریباں کی احتیاط
مدت سے چاکِ زخم ہے دل میں کھلا ہوا

نہ چاہتے ہوئے بھی بدک کر چلا گیا
اس کی گلی سے تھا مرا رستہ ملا ہوا

اس دشت کشتگاں میں بھی رقصاں ہے میری خاک
دیکھو اے آندھیوں یہ مرا حوصلہ ہوا

یہ مت سمجھنا لوگوں نے خود ہی جلا دئے
تم کو ملے جو راہ میں خیمہ جلا ہوا

کہتے ہیں جس کو موت مرا نقشِ پا سہی
میں چل پڑا تو وقت مرا سلسلہ ہوا

○

دل پر وفا کا قرض ہے جاں پر لہو کا قرض
اے خاکِ کوئے یار تری آبرو کا قرض

بادہ کشو کے نام پہ موسم نے لکھ دیا
یا موج گل سے رہن یا جام و سبو کا قرض

جو نام رہگزار بہاراں تھا مل گیا
باقی ہے منزلوں پر مری جستجو کا قرض

ہم اعتبار درد وفا سے ادا کریں
جاں سے کہیں گراں ہے تری آرزو کا قرض

☆☆

جوشِ نمو کے آگے بگولے ہیں سرنگوں
خاک چمن بہار کے احساں سے دب گئی

○

1980

زد میں ہوں بگولوں کی تو صحرا دیکھوں
دریا میں اتر جاؤں تو دریا دیکھوں

جب تک میں جیوں آس کو زندہ رکھوں
رُت کوئی سی ہو میں ترا رستہ دیکھوں

جب وقت کا نام آئے تو میں حیرت سے
خود اپنے ہی شہپر کا تماشہ دیکھوں

یزداں کے اہرمن کے ستارے ڈوبے
انسان کے سورج کو ابھرتا دیکھوں

18-2-80

☆☆

تیری جفا کا تذکرہ تیرے ہی روبرو
اہلِ وفا کی جرأت اظہار دیکھنا

○

زمین تال پہ قدموں کی گنگناتی ہے
ہوا بھی اب مرے لہجے میں بات کرتی ہے

کرن کرن ہے سحر کی یقیں کا رنگ لئے
طواف میرے چراغوں کا رات کرتی ہے

ہوں برق و رعد کہ سیلابِ باد و باراں ہو
چپ ہیں کہ بات فقط میری ذات کرتی ہے

میرے بدن کا سفر ساری کائنات میں ہے
مرے بدن میں سفر کائنات کرتی ہے

مرا وجود قیامِ نگارِ نگہتِ گل
بہار میری نظر سے ثبات کرتی ہے

20-2-80

☆☆

سڑکوں پہ نہ گلیوں میں قدم رکھنے کی جا ہے
کس دلدلی کیچڑ میں شہر ڈوب رہا ہے

○

آج یارو نے جو کی انجمن آرائی بہت
یاد آئی مجھے کھوئی ہوئی تنہائی بہت

تم سے جب بچھڑے تھے کچھ تم نے کہا تھا شاید
یاد نہ آئی وہ اک بات جو یاد آئی بہت

اجنبی بن کے وہ گزرا ہے تو کیسے چپ ہیں
ہم جو کہتے تھے کہ اس سے ہے شناسائی بہت

مجھ پہ الزام کوئی آیا تو یہ آئے گا
خالی دامن کو لیے پھرتا ہے سودائی بہت

تین شعر

اس لمحہ میں پرواز کو پر تول رہا تھا
منصور کی آواز میں، میں بول رہا تھا

شکوہ نہ کرو ڈھے گئے گر کچے گھروندے
سیلاب تو انساں کے ہنر کھول رہا تھا

خوں گشتہ سروتار قفس دیکھنے والو
آزاد ہواؤں کا بڑا مول رہا تھا

○

نہ ابتدا نہ کوئی انتہا سفر میں ہوں
ہر اک قدم نئی منزل کی رہگذر میں ہوں

پڑھا گیا ہی نہیں ہے ابھی مرا مکتوب
ابھی تو دوستو میں حرفِ نامہ بر میں ہوں

یہ کائنات مری خوشبوؤں میں لیتی ہے سانس
ہوا کے لہجہ میں ہوں صبح کی نظر میں ہوں

مری انا کی حدیں تیری ذات میں گم ہیں
تو مرے ساتھ ہے میں جب سے اس سفر میں ہوں

تین شعر

آئینہ میں اپنی ہی تصویر نظر آئی
ہم خود ہی تماشا ہیں اور خود ہی تماشائی

صحرا پہ خدا جانے کیا حادثہ گزرا ہے
ویرانی سی ویرانی، تنہائی سی تنہائی

سب یادوں کے موسم ہیں سب درد کی برساتیں
ہر وقت کی ٹیسیں ہیں ہر وقت کی پروائی

○

حرف کو لمحوں کے سینے میں اتارا جائے
پھر ہواؤں کی طرح تجھ کو پکارا جائے

تجھ کو دیکھا ہے تو اکثر مجھے دھیان آیا ہے
تجھ سے رنگ لے کے زمانے کو سنوارا جائے

شرط لہروں سے یہ طے کی ہے سفر سے پہلے
ڈوب جاؤں میں تو بھی پار اتارا جائے

شاہراہوں سے صداؤں کی جلی راکھ لئے
سوچتا ہوں میں کس آندھی کو پکارا جائے

لہر جب لوٹ گئی مڑ کے نہ دیکھا اس نے
ساتھ آئے یا بہت دور کنارا جائے

مانگ کر لائے چراغوں کا بھروسہ کیا ہے
یوں نہ ہو آگ لگے گھر بھی ہمارا جائے

19-3-80

○

نوکِ نشتر پہ تُل رہے ہیں خواب
اے خدا لا مرے عذاب و ثواب

مجھ سے پرسش نہ کر خدا جانے
تجھ کو دینا پڑیں گے کتنے حساب

موسموں نے اڑا دئے سب رنگ
بارشوں نے بھگو دی ساری کتاب

خیرو شر کی وراثت آئی ہے
ہم ہیں یزداں و اہرمن کا حساب

تین شعر

اپنے قامت کو بڑھانے کے لئے
خود کو لٹکا لیا ہے سولی پر

اک سفر نامہ ہے مرا تاریخ
ہر سفر میرے خوں بہا کا سفر

وہ جہاں پر ترا گماں بھی نہیں
ڈھونڈتی ہے تجھے وہاں بھی نظر

○

جانے کیا تاریکیوں نے راستوں سے کہہ دیا
پتھروں سے سر کو ٹکراتے رہے پتھر کئی

یہ وہ چوراہا ہے جس پر تحفتاً پاتے ہیں لوگ
بارشِ سنگ یورشِ الزام کے نشتر کئی

جا بجا ٹوٹے ہوئے پتھر شکستِ جاں نہیں
ان چٹانوں نے کیئے ہیں معرکے بھی سر کئی

کون سی منزل پہ ہوگا کس کا چہرہ معتبر
ایک رہزن ہے کہ جسکے روپ میں رہبر کئی

میں ابھی تک ناتراشیدہ بتوں کی سوچ ہوں
منتظر ہیں ایک چہرے کے مرے جوہر کئی

ہم سے لوگوں کو نہ دینا تہمت بے مائیگی
خاکِ وحشت کے لیے درکار ہیں محشر کئی

9-4-80

○

میں رہگذر کے کنارے کی بندشیں توڑوں
کہ جنگلوں میں بھٹکتا پھروں ہوا کی طرح

یہ صرف نام کا دھوکہ ہے خود جو آئے خدا
تو خلق اس کو نہ پوچھے گی پھر خدا کی طرح

لکھا ہوا رہوں سینوں پہ احترام کے ساتھ
میں در بدر بھی پھروں شہر میں وفا کی طرح

غریبِ شہر کے چہرے پہ کیا لکھا دیکھا
ہر ایک ملنے لگا ہے اب آشنا کی طرح

وسیع عمارتیں مجھ سے سوال کرتی ہیں
کیوں در بدر میں پھرا عمر بھر ہوا کی طرح

☆☆

زنجیریں پہنانے والوں، بہتر ہے یہ بھی سمجھو
ان ہاتھوں نے ڈھالا ہے ان کو یہی ہاتھ گلا دیں گے

○

دریا ہوں اپنی موج میں زندہ ہوں دوستو
خشک ہوگیا تو لوگوں کا رستہ ہوں دوستو

ہر موڑ گنگناتی ہے شوریدہ سر لہر
میں کار زارِ شوق کا نغمہ ہوں دوستو

پربت کے کچھ پیام سمندر کے نام ہیں
میں سیلِ جاوداں کا اشارا ہوں دوستو

ابھرے نہ آج تک جنہیں میں نے ڈبو دیا
ورنہ تو ایک خموش سا دھارا ہوں دوستو

☆☆

کہنے کو تو ہم سے بھی شناسائی ہے لیکن
جب بھی وہ ملا ہم سے خدا بن کے ملا ہے

ملکیت

ملکیت سانپ کے پھن کی طرح لہراتی ہوئی
کبھی غیروں کو کبھی اپنوں کو ڈس لیتی ہے
مال و زر میرا یہ گھر بار یہ عورت میری
یہ امر بیل مری روح کو کس لیتی ہے

بھوک ومحرومی میں لپٹے ہوئے بے نور اجسام
حیثیت والو میں بے حیثیت و سرگرداں
ملکیت پہ یہی الزام بہت کافی ہے
کہیں لٹتے ہیں ضمیر اور کہیں بکتی ہے زباں

عشق اک جذبہ معصوم ہے ہر انساں کا
سو بھی آزاد نہیں جراتِ رندانہ سے
پیاس لگتی ہو تو صحرا سے گزرنے کی شرط
دل طلب گار ہو اور لوگ ہوں بے گانہ سے

حسن تخلیق کی معراج ہے جس کی تکمیل
اک جز میں ہوں اور اک مری محبوبہ ہے
وہ بھی اس بے درودیوار کے زنداں میں اسیر
اس کی پہچان مرے نام سے ہی زندہ ہے

گھر میں بازاروں میں دفتر میں شبستانوں میں
روح آزاد کا اس میں کوئی حصہ ہی نہیں
سوچ اس کی ہے نہ جسم اس کا نہ وقت اس کا ہے
ذات اس کی ہے مگر اس کو تو دیکھا ہی نہیں

علم پر دسترس ان کو ہے جو قیمت دے دیں
ورنہ پھر دشتِ جہالت میں بھٹکنا ہوگا
ان کو مل جائے گا انصاف جو رشوت دے دیں
ورنہ پھر ظلم کے سائے میں سسکنا ہوگا

حسن و عشق علم و ہنر فکر و نظر عزتِ نفس
کون سی شے ہے جو اس زہر سے اب خالی ہے
اک تعفن ہے کہ اقدار کی سانسیں رک جائیں
ملکیت زندہ ضمیروں کے لیے گالی ہے

30-4-80

○

سورج کا بدن لئے ہوئے ہوں   سب نور اسی کائنات سے ہیں
سمتوں کی میں قید کیسے توڑوں   سمتیں تو میری ذات سے ہیں
دل ہی تو ہے اداس سا ہے   مایوس کب ملاقات سے ہیں
جب صبح ہو تو سو نہ جائیں   جاگے ہوئے لوگ رات سے ہیں

☆☆

براہ راست جو تسخیرِ فطرت میں ملوث ہے
ہم اس کو اعتبارِ آدمی مزدور کہتے ہیں

زندہ رہنے کے لیے بیچتا رہتا تھا لہو
کل لہو بیچ کے آیا تو وہ زندہ نہ رہا

اس طرح ٹوٹ کے بکھرا ہے مکاں کا ملبہ
اپنے ہی گھر میں ہوں میں قید کہ رستہ نہ رہا

ڈھول بجتا ہے نہ ہے میرا قبیلہ رقصاں
مجھ کو جب قتل کیا پھر وہ تماشہ نہ رہا

جانے اب کس کے حوالہ کیا لوگوں نے چمن
شاخ زندہ نہ رہی پھول شگفتہ نہ رہا

ہم اگر وضع قبا رکھتے بھی تو کیا رکھتے
جب گریبان کسی زخم کا پردہ نہ رہا

17-5-80

☆☆

عبث ہے کوئی توقع کہ میں ہوں یا تم ہو
ہر ایک اپنے مفادات کے حصار میں ہے

ہو کے حیران بہت شوخی جاں ٹھیر گئی
تجھ کو دیکھا تو مری عمرِ رواں ٹھیر گئی

وہ جو اک سادہ سی لڑکی مرے دفتر میں ہے
اس سے کچھ کہنا جو چاہا تو زباں ٹھیر گئی

ہم نے ہی صفحہ قرطاس پہ لکھا ہے لہو
ہم سے ہی حرمتِ الفاظ و بیاں ٹھیر گئی

کس نے چوری کیا اس شہر سے بازار کا شور
ہیں دکانیں تو کھلی خلق کہاں ٹھیر گئی

موسم گل بھی نہیں تیری تمنا بھی نہیں
ایک کانٹا سا مگر شورشِ جاں ٹھیر گئی

20-5-80

وہ جو محنت کی طرف میرا رویہ ہوگا
وہ مری زیست کی ہر قدر میں بستا ہوگا

گھر بھی تعمیر کرو تا کہ نمازی بھی تو ہو
ورنہ ویرانہ میں مسجد کا بھلا کیا ہوگا

جیب میں دام نہیں اور گراں ہے منڈی
کون سا سودا ہے جو ہم سے بھی سستا ہوگا

کہکشاں کیجئے آباد مگر شرط یہ ہے
وہاں انساں زمین جیسا نہ رسوا ہوگا

اس کی تنہائی بھی یوں دل میں اترتی ہوگی
چلتا ہوگا کبھی بے وجہ ٹھہرتا ہوگا

☆☆

جرأتِ کفر بڑی چیز ہے اے بار الٰہ
اس گنہ گار کو سچ کہنے کی توفیق ہی دے

کتنے موسم آئے گئے ہیں یاد تو کرلیں
اس سے کتنی بار ملے ہیں یاد تو کرلیں

کتنے زخم بھرے ہیں جن کی خلش باقی ہے
کتنے چاک اب تک نہ سلے ہیں یاد تو کرلیں

کیسی پرانی باتیں اب تک یاد رہی ہیں
کتنے نئے افسانے ملے ہیں یاد تو کرلیں

کس پت جھڑ میں کون سے پتے ٹوٹ گرے تھے
پھول بجھے ہیں داغ جلے ہیں یاد تو کرلیں

برکھا رت میں کمرے کی چھت بیٹھ گئی تھی
آنگن میں سیلاب چلے ہیں یاد تو کرلیں

جب بھی اس سے بات کی ہم نے سوچا ہوگا
اس چہرے کے رنگ نئے ہیں یاد تو کرلیں

○

سارا دریا بھی دریا ہے اک لہر بھی دریا ہے
پانی اٹھ کر پوچھ رہا ہے تیرنے والا کیسا ہے

لوگو اسے الزام نہ دینا خود بھی قتل ہو جاؤ گے
مانا کہ ایک قتل ہوا ہے، قاتل دیس کا راجہ ہے

وہ جو سب کا ہاتھ جھٹک کر لہروں پہ چل نکلا تھا
اپنے بدن کے بوجھ کے نیچے دھیرے دھیرے ڈوبا ہے

آنے والی نسلیں لوٹ کے لے جائیں گے اثاثے کو
اس بستی میں جو کچھ بھی ہے تیرا ہے نہ میرا ہے

برسوں سے میں سوچ رہا ہوں پھر بھی یاد نہیں آتا
جس نے مجھے آزار دیا ہے اس کو کہاں کب دیکھا ہے

☆☆

اس دورِ نادہند میں کیا مانگتے ہیں آپ
انسان کھو گیا ہے خدا مانگتے ہیں آپ

○

مکھیا نے وہ نیم کا پیڑ ہی کٹوا ڈالا
گاؤں والے دھوپ میں کس کا سایہ ڈھونڈیں

بچے بچیں، بیماروں کی جیب ٹٹولیں
لوگ یہاں کس کس ڈھنگ سے سرمایہ ڈھونڈیں

نفس کی دیواروں میں سب محصور ہوئے
کہاں سے یارو اک اچھا ہمسایہ ڈھونڈیں

لوگوں کو سائے کی پیاس اب اتنی ہے
جلتے سورج کے نیچے بھی سایہ ڈھونڈیں

☆☆

مرے جسم کے لہو نے کیے ثبت نقشِ منزل
یہ نشان میری فتح نہیں یہ شکستِ راہزن ہیں

جانے کب لوٹوں پھر ادھر کو
نکلا ہوں خلاؤں کے سفر کو

سب پیار زمین کے باسیوں کو
سب رفعتیں عظمتِ بشر کو

کرنوں کی لہر کا ہمسفر ہوں
لمحہ، صدیوں کی رہگذر کو

وہ کہکشاؤں کی حسینہ
آراستہ کر رہی ہے گھر کو

رقاصۂ خلد کی پائل
چھنکے جھنکائے رہگذر کو

ہے کہکشاں سے آگے کیا کیا
رستہ یہ گیا ہے کس نگر کو

اس عہد کی سچائی کی مہر جب ان پہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ دستاویزیں جھوٹی ہیں یہ سارے کاغذ جعلی ہیں

وہ سارے صحیفے ردّی ہیں جو کلکِ لہو سے لکھے نہ گئے
ان حرفوں کے رنگ پھیکے ہیں اور لفظ اندر سے خالی ہیں

نہ اپنی ذات نہ اس کا حسن نہ دھرتی سے ہم سچے ہیں
جو آوازیں ہم گڑھتے ہیں وہ جھوٹی کہانی والی ہیں

مذہب کے نام پہ قتل ہوا تہذیبی شعور انسانوں کا
ہم گنتے رہے یہ تلواریں کس کس پہ گرنے والی ہیں

جو شعر و ادب انسانوں کو زندہ رہنے کا عزم نہ دے
وہ ریت کا کچا گھروندا ہے اور لہریں آنے والی ہیں

31-5-80

سمٹے ہوئے اعصاب بکھر نہ جاتے
مایوس جو ہم ہوتے تو مر نہ جاتے

کچھ لوگ جو پرزوں میں بکھر نہ جاتے
بے رحم ہواؤں کے ہنر نہ جاتے

یارا نہیں فٹ پاتھ سے اٹھنے کا ہمیں
ہم ٹھیک اگر ہوتے تو گھر نہ جاتے

ان گلیوں میں جلتی ہوئی دہلیزیں ہیں
رہتے ہیں وہاں ورنہ ادھر نہ جاتے

پھر دنیا کو کیا تہہ کا پتہ مل جاتا
ہم لوگ جو دریا میں اتر نہ جاتے

☆☆

آنے والی صدیوں میں اک ایسا وقت بھی آئے گا
جو مزدور نہ ہوگا وہ انسان نہیں کہلائے گا

ہر قدم دل میں نئے زخم کا ہوتا ہے پڑاؤ
زندگی ایسے ہے جیسے کسی ساحل کا کٹاؤ

مصلحت کہہ کے بہت دھوکے دیئے ہیں ہمکو
خضر نے چھید کیا اور ڈبو دی ناؤ

عقل سے سوچو خدا عقل میں نہ آئے خدا
عقل کو سوخت کئے دیتا ہے مذہب کا الاؤ

جب مرے دور کی تاریخ لکھی جائے گی
گرم بازاری میں گر جائے گا فرعون کا بھاؤ

میرے دیوان پہ یہ حکم ہوا ہے رضوی
راکھ بھی شہر نہ آئے اسے دریا پہ جلاؤ

4-6-80

☆☆

گرد کی اتنی تہیں دل پہ جمی ہیں کہ لوگ
سالہا سال بھی روئے تو نہ دھل پائینگی

دل بھی معصوم ہے بچوں کی طرح
دونوں ایک دم سے مچل جاتے ہیں

ہر دفعہ جھوٹے وعدے کرتا ہوں
دونوں ہر بار بہل جاتے ہیں

دونوں انگارہ اٹھا لیتے ہیں
ہاتھ جلتا ہے تو رو دیتے ہیں

روٹھ کر راہ میں رک جاتے ہیں
اور پھر راستہ کھو دیتے ہیں

سیم و زر دور پھینک دیتے ہیں
خوشنما پر بڑا سرمایہ ہے

آتی لہروں پہ خفا ہوتے ہیں
ریت کا گھر بڑا سرمایہ ہے

5-6-80

پھر کوئی قیس سرِ راہگذر آتا ہے
کیا غزالاں تمہیں چاہت کا ہنر آتا ہے

کل ٹہلنے کو جو نکلیں گے تو دیکھ آئیں گے
دور سے آسماں ایک رنگ نظر آتا ہے

بزم یاراں میں جو چھڑ جائے کہانی اس کی
میکدہ یاروں کے ہونٹوں پہ اتر آتا ہے

بولنے کی ہی اجازت نہیں اس محفل میں
ورنہ کچھ کہنے کا ہم کو بھی ہنر آتا ہے

کوئی کہتا نہیں بادل تھے بنائے سیلاب
سارا الزام تو دریاؤں کے سر آتا ہے

7-6-80

○

اک کلو خربوزے لے کر سو کا نوٹ بھُنایا تھا
ایسے اُڑ گیا جیسے کسی اُڑتی چڑیا کا سایا تھا

اچھی مری حفاظت کی میرے گھر کی دیواروں نے
آندھی میں، میں خاک بدن تھا سیلابوں میں نہایا تھا

سارے شہر میں میرے دکھ سکھ اس سے زیادہ کسے معلوم
جس نے میری دیوار گرا دی وہ میرا ہمسایہ تھا

میں اس سے کچھ کہہ نہ سکا اور وہ بھی چپ چپ لوٹ گیا
جانے کیا دکھ تھا جو آدھی رات مرے گھر آیا تھا

☆☆

جیسے منجدھار میں کھوئی ہوئی لہر
وہ جو بچھڑا تو دوبارہ نہ ملا

○

جھوٹ ایسا کہ جو سچ بھی نہ چھپانا چاہے
وہ خفا رہ کے مرا ساتھ نبھانا چاہے

دل وہ معصوم کہ جب مچلے تو ایسے مچلے
چھوڑ دے لعل و گہر آگ اٹھانا چاہے

اپنی پلکوں پہ مرے آنسو لئے پھرتا تھا
آج وہ ترکِ تعلق کا بہانہ چاہے

مرگیا قیس تو جنگل کی فضا کہتی ہے
ان غزالاں کو جو چاہے تو دوانہ چاہے

بند مدت سے ہوئی ہے رسدِ اہلِ جنوں
دل بیاباں کو چلا خاک اڑانا چاہے

خلقتِ شہر کو پرچم کی ضرورت ہے یہ دل
دھجیاں میرے گریباں کی اڑانا چاہے

6-6-80

○

میں خود سے سوال کر رہا ہوں
آئینہ جواب دے رہا ہے

برسوں سے جو عکس منجمد ہیں
آج ان کا حساب دے رہا ہے

میں اتنا گنہ گار کب تھا
وہ کس کا عذاب دے رہا ہے

دیواریں تو چپ ہیں میرے گھر کی
پھر کون جواب دے رہا ہے

☆☆

تحریریں سیاہی کی جبینوں سے عیاں
کچھ لوگ اولوالامر کی چوکھٹ کا نشاں ہیں

○

قریۂ جاں میں پلٹنے کی کوئی راہ نہیں
وہ مجھے چھوڑنے آئی تو کہاں چھوڑ گئی

میرے ہی گھر میں تھا وہ حبس کہ آندھی اٹھی
اور یوں گزری کہ میرا ہی مکاں چھوڑ گئی

اعتبار اپنا گیا اور یقین کیا ملتا
بندگی لوگوں میں کتنے ہی گماں چھوڑ گئی

وہ بہاروں میں بھی باعث رہے رسوائی کے
جو نشانات مرے تن پہ خزاں چھوڑ گئی

اس کا چہرہ تو نہیں یاد مگر وہ لڑکی
روح میں تیرتے قدموں کے نشاں چھوڑ گئی

O

دہلیز پہ راتوں کی اک جلتا دیا رکھنا
پلکوں کے دریچوں پہ اک آس سجا رکھنا
دروازہ کھلا رکھنا

بھیگے ہوئے جنگل سے وحشی کی صدا آئے
کیا جانئے کب اس کی جانب سے ہوا آئے
دروازہ کھلا رکھنا

متوالوں کی بستی میں کب جانے خبر پھیلے
کب رنگِ حنا ابھرے بانہوں کا سحر پھیلے
دروازہ کھلا رکھنا

تاریکی کے صحرا سے اس دل کی صدا ابھرے
اک آبلہ پا آئے اور نقشِ وفا ابھرے
دروازہ کھلا رکھنا

جب تک دلِ آوارہ ان راہوں پہ آ پہنچے
زندانوں کی بستی سے پیغام مرا پہنچے
دروازہ کھلا رکھنا

جب درد کی چوکھٹ پہ سجدے کے لئے آئیں
ایسا نہ ہو اے جاناں دروازہ کو بند پائیں
دروازہ کھلا رکھنا

اک جلتا دیا رکھنا

30-10-80

O

وہ ایک ہنگامۂ رنداں جو خرابات میں ہے
بس وہی تذکرہ قرآن کی آیات میں ہے

شہر والو مجھے گمنام نہ دفنا دینا
غربتِ شہر کا ہر رنگ مری ذات میں ہے

اسی سرمایہ پہ ہوں معتمدِ فصلِ بہار
تری خوشبو کا کوئی رنگ مری بات میں ہے

کیسے رشتہ سے بندھی شہر سے بستی رضوی
بارشیں شہر میں سیلاب مضافات میں ہے

☆☆

یہ کیسا نظام میکدہ ہے
یہ کیسا ہے اہتمام یارو
جن ہاتھوں نے مے کشید کی ہے
خالی ہیں ان ہی کے جام یارو

○

عکس قائم اگر نہیں ہوتا
آئینہ معتبر نہیں ہوتا

سامنے جا کے ٹھہر جاتا ہوں
آئینوں میں سفر نہیں ہوتا

روشنی تو مرے بدن کی ہے
آئینہ نور گر نہیں ہوتا

اپنے ہی دائروں میں بھٹکو گے
آئینہ رہگذر نہیں ہوتا

دیکھتا ہے مری نظر سے مجھے
گو وہ میری نظر نہیں ہوتا

عکس ہیں آئینہ در آئینہ
ہم سے اتنا سفر نہیں ہوتا

خود سے وہ کتنا بے خبر ہوتا
آئینہ کوئی گر نہیں ہوتا

چہرہ شاید ہوا کا مدہم ہے
آئینہ کم نظر نہیں ہوتا

آئینوں کی گواہی دو رضوی
ہم سا آشفتہ سر نہیں ہوتا

تین شعر

ٹھوکر جو کسی کی کھاتا ہوگا
پتھر کا وجود سنسناتا ہوگا

تالاب کی لہریں گن رہا ہوں
ہے راستہ میں وہ آتا ہوگا

وہ مجھ سے راہ میں آملے گا
اس درد سے جس کا ناطہ ہوگا

○

بے سائباں بستی کے گھر بولنے لگے
کل شب ہَوا چلی تو کھنڈر بولنے لگے

کتنے دکھوں کی چاپ اسے دے گئے ہیں لوگ
سناٹا ہو تو راہگذر بولنے لگے

میں ہوں حریف تندیٔ امواج صبح و شام
میرے مقابلے پہ بھنور بولنے لگے

دورِ یزیدیت کا نہ پھر اہتمام کر
ایسا نہ ہو لہو کا ہنر بولنے لگے

پھر راہِ شام تشنۂ پائے فگار ہو
پھر کربلا میں نیزے پہ سر بولنے لگے

کیسا لہو اچھال گئے ہیں چمن کے لوگ
گل کی قبا میں رنگِ سحر بولنے لگے

اس ساعت جدائی میں کب اس سے کچھ کہوں
وہ چپ ہوا تو دیدۂ تر بولنے لگے

رضوی تمہارے سینے میں وہ آگ ہی نہیں
یاہو کی ایک صدا پہ نگر بولنے لگے

☆☆

کیا جانئے کیوں اس کو مرا دھیان نہ آیا
وہ شخص ستمگر سہی پتھر تو نہیں تھا
حیران ہوں کیا سوچ کے نیند آ گئی مجھ کو
دیوار کا سایہ تھا مرا گھر تو نہیں تھا

○

نہ بزم مے نہ در میکدہ نہ گردشِ جام
جمع ہوں یار کہاں اب کہاں لیں تیرا نام

تری صدا کا ہمیں انتظار ایسا ہے
کہ اپنے دل سے بھی مدت سے کر نہ پائے کلام

اک عمر کٹ گئی اور فیصلہ نہ کر پائے
تھی صبح ہجر قیامت کہ ابتدائے شام

شب وصال سے اک تیرا سلسلہ تو ہے
شب فراق تجھے ناامید دل کا سلام

وہ ایک کرب جو تخلیق کی علامت ہے
جنوں کا فیض ہے قصیدہ لکھو جنوں کے نام

اے ماہتابِ امید وصال آ سرِ بام
بھڑک رہے ہیں بدن اور سلگ رہے ہیں جام

تمہارے گیسو و رخسار و لب بھی کیا شے ہیں
فقیہہ شہر نے سب جرم لکھ دئے مرے نام

نہ آبرو ہے نہ جاہ و طلب نہ مال و منال
پھر اور کس طرح لیتے ہیں عشق کا الزام

☆☆

موجوں کا تماشا دیکھتے ہیں
دریا کے مزاج داں نہیں ہیں
اس حد سے آگے پھر زمین ہے
سچ یہ ہے کہ آسماں نہیں ہیں

○

آندھیوں نے جو چلائے پتھر
سب مری سمت ہی آئے پتھر

ایک ہم تھے جو گنہ گار نہ تھے
ہم نے ہی شہر میں کھائے پتھر

جب سے سورج ٹھہر گیا سر پہ
ہوگئے لوگوں کے سائے پتھر

اتنے ارزاں تو نہ تھے دیوانے
زخم کھا کے پلٹ آئے پتھر

بے گنہ ہو نہ ہو ہمارے لئے
جس کا جی چاہے اُٹھائے پتھر

اور کس کام آئے دل کی آگ
اپنے شعلوں میں نہائے پتھر

ہم نے سب لعل و گوہر چھوڑ دیے
جب سے آنکھوں میں سمائے پتھر

تین شعر

مری مٹھی میں جو لمحہ ہے وہی میرا ہے
باقی اے جانِ جہاں سارا جہاں تیرا ہے

ٹوٹ کے برسے گا بادل تو نکھر جائیں گے
خاک کا رنگ درختوں پہ بہت گہرا ہے

شاید اب باتوں ہی باتوں میں وہ اقرار کرے
میں نے موضوعِ محبت پہ اسے گھیرا ہے

نذیر عباسی کے نام

اک اور شخص اپنے لہو میں اتر گیا
جینے کی دعا جس کے لیے تھی وہ مر گیا

ایامِ گل کچھ اس کی پذیرائی چاہیے
تیری طرف ہمارا بھی اک نامہ بر گیا

آندھی کی شہ پہ اڑتے ہوئے پتھروں کا غول
لمحوں میں سارے شہر کو سنگسار کر گیا

وہ شخص جس کی آن پہ سجتے تھے آفتاب
تاریکیوں کے سانپوں کے ڈسنے سے مر گیا

پانی تو اب چلا ہے پہاڑوں کی سمت سے
کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں دریا اتر گیا

7-10-80

چوکیدار

جاگتے رہنا جاگتے رہنا
(سارے فلیٹوں میں تو سب ہی سوئے ہوئے ہیں
میں کس کو آوازیں دیتا رہتا ہوں)
جاگتے رہنا۔ جاگتے رہنا
(رات تو کافی گذر گئی ہے)
(دو یا شاید تین بجے ہیں)
جاگتے رہنا
(چلتے چلتے کہیں کہیں لاٹھی بھی بجالوں)
ٹھک ٹھک۔ ٹھک ٹھک
جاگتے رہنا
(گیٹ تو دونوں بند کئے ہیں
دیکھ لوں پھر بھی)
جاگتے رہنا
(فلیٹوں کی ٹنکی کی موٹر بھی تو چلا دوں)
تین سو تنخواہ ہے اور کتنے دھندے ہیں)
جاگتے رہنا

(دن میں بھی کل کب سویا تھا)
(محرومی کے رنگ بھی کتنے گہرے ہیں)
جاگتے رہنا
(پھر کوئی اس پھاٹک پر آیا
بارہ نمبر والا ہوگا
جانے کہاں سے پی آتا ہے)
جاگتے رہنا
(چور کسی بھی شکل میں آئے میں اس کو پہچانوں گا)
(لیکن کوئی گھر والا جب لوٹ کے گھر لے جائے
اس کو کیسے جانوں گا)
جاگتے رہنا
(اک ذرا سی دیر کہیں میں بیٹھ نہ جاؤں
نہیں۔ نہیں)
جاگتے رہنا
(سو جاؤں گا)
(کوئی گھر لٹ جائے گا)
جاگتے رہنا

(گیٹ بھی کھولوں)
جاگتے رہنا
(صبح ہوئی)
لوگو تمہاری جانیں امانت تھیں شب بھر کو
صبح ہوئی ہے واپس لو
جاگتے رہنا
(لوگو ہے جب سے ہوش سنبھالا
میں راتوں کو سویا نہیں ہوں)
(لوگو میری امانت میری نیندیں
مجھ کو واپس کر دو)
جاگتے رہنا

29-9-80

دھوپ جب زاویے بدلتی ہے   کتنے سائے نگلتی چلتی ہے

میرے چہرے پہ راستوں کی ہوا   کن امیدوں کی خاک ملتی ہے

جانے کب جل کے راکھ ہو جائے   میرے خیمہ میں آگ پلتی ہے

اتنے چھوٹے نہ تھے کبھی یہ دن   صبح ہوتے ہی دھوپ ڈھلتی ہے

جسم کا خار زار ہے اور سانس   پا برہنہ کی طرح چلتی ہے

وقت ہمیشہ سفر میں رہتا ہے   زندگی منزلیں بدلتی ہے

سرد یخ بستہ ہوا میں رضوی   جانے کیا چیز ہے جو جلتی ہے

12-12-80

ہنسی میں سادہ دلی ہے نہ آنسوؤں میں خلوص
میں اپنا چہرہ کہیں اس سفر میں بھول آیا

پکارتا رہا لوگوں کو اور میں قتل ہوا
فلیٹوں سے کوئی جھانکا نہ کوئی شخص آیا

مرے وجود کا ظاہر ہے ایک سناٹا
مرے وجود میں محو سخن مرا سایہ

مرے فلیٹ کا فرش میرے نیچے والوں کی چھت
الگ معیار میں رہتا ہے ساتھ ہمسایہ

☆☆

آشنا ذریعہ اظہار نہیں ملتا ہے
لفظ اب صورت گفتار نہیں ملتا ہے

شور اتنا ہے عدالت میں اہلکاروں کا
مجھ کو اک لمحہ انکار نہیں ملتا ہے

تم ہی نے شہر کے لوگوں کو غلط سمجھا ہے
آدمی صورتِ دیوار نہیں ملتا ہے

ہائی جیکرز سے

ان بارشوں کا پانی تو پی جائے گی زمیں
دریا کے بہنے کے لیے سیلاب چاہیے

مٹ جائے گا پیروں کے تلے داغ لہو کا
اس راہ میں تو خون کا تالاب چاہیے

حاصل نہیں ہے کچھ بھی بگولوں کے کھیل سے
صحرا کو آندھیوں کی تب و تاب چاہیے

دو چار لفظ دوست مری داستان نہیں
میرے لئے تو صدیوں کا ایک باب چاہیے

16-3-81

☆☆

نوٹ: پی آئی اے کی فلائٹ 326 جو کراچی سے پشاور جارہی تھی اسے الذوالفقار کے ایک کارکن سلام اللہ عرف ٹیپو نے تین اور کارکنوں کی مدد سے ہائی جیک کرلیا تھا ان کا مطالبہ تھا کہ 54 سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ ضیا الحق نے ہائی جیکرز کے مطالبات مانتے ہوئے 50 سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا تھا۔ طیارہ پہلے کابل (افغانستان) اور پھر دمشق (شام) میں اتار لیا گیا اور مسافروں کو رہا کر دیا گیا۔

○

مدت سے مرے لب پہ ترا نام نہ آیا
کیا کہیے کہ یوں بھی مجھے آرام نہ آیا

کس دن نہ رہا تیرے سراپا کا تصور
کس رات یہ مہتاب سرِ جام نہ آیا

کس رات تری زلف کی خوشبو نہیں آئی
کب دل نہیں دھڑکا ترا پیغام نہ آیا

کس دن نہ ہوئے ماند چراغ اشکوں کے آگے
خوشبو کی طرح دل میں تیرا نام نہ آیا

☆☆

یاد آ گئے ستم جو فراموش ہو گئے
کچھ میرا تذکرہ تھا جو خاموش ہوگئے
محفل میں سب ہی تیرے طرفدار تھے مگر
کیوں میرا ذکر آتے ہی خاموش ہوگئے

○

تھا بادباں سے زیادہ بھروسہ مجھے جس پر
وہ ایک ستارہ بھی مرے کام نہ آیا

جس چاک گریباں سے تھی اس شہر کی رونق
فہرست بنی تو وہی اک نام نہ آیا

آشفتہ سری سے ہمیں فرصت تو ملی تھی
ہم خوش نہ رہے جب کوئی الزام نہ آیا

ہم زنداں نصیبوں کی طرف یوں تو کئی بار
گذری ہے صبا پر ترا پیغام نہ آیا

دیوانہ کسی حال بھی خالی نہیں رہتا
زخم آیا کئے جب کوئی الزام نہ آیا

☆☆

روزمرہ بدل گیا ہے یہاں
زخم اب پیرہن کو کہتے ہیں
ہم جو کہتے ہیں اک آس تو ہے
عشق کے بانکپن کو کہتے ہیں

تنہائی

عظیم اسٹیل مل کی راہ پہ
قریب ہی
ٹین کا ایک وسیع شیڈ ہے
جہاں پہ تعمیر کی مشینوں کی اولین کھیپ آ کے اتری
جہاں پہ خانہ بدوش مردوں اور عورتوں نے
ہدایتیں لیکے پہلی حد بندیاں کھڑی کیں
یہ مل آج اپنے شباب پر ہے
یہ شیڈ، تنہائی کے موسموں کے عذاب میں ہے

یوم مئی

وقت کی گذرگاہ پہ
یوم مئی کا قبضہ ہے

میں اسے عقابوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے
ہوا کی سنسناہٹ سے
آندھیوں کے شور سے
طوفاں کی گھڑ گھڑاہٹ سے
مشابہہ کہہ نہیں سکتا
سمندروں کی لہروں کی بے پناہ اونچائی
سمندروں کی گہرائی
دیوتا کے مسکن سے
ہمالہ کی شناسائی
ہیچ بھی ہیں کمتر بھی
یوم مئی کا جلوس
اک عجیب ہی شے ہے
سرخ پرچموں کی لہر

سنسناہٹ
جذبوں کی
جوش حدتیں تپش
بے پناہ بلندیاں
بے پناہ گیرائی
قافلہ رواں دواں
نعرہ زن فلک شکن
زندگی کا وہ نغمہ
جس کے ساز و آہنگ میں
حسن ہے جوانی ہے
سچ کی جد و جہد میں
سارے مرنے والوں کی
ضوفشاں کہانی ہے
تمتمائے چہرے ہیں
اور بلند بازو ہیں
بوندوں میں پسینے کی
زندگی بدلنے کی
آرزو مچلتی ہے
انقلاب کی لگن

آنکھوں میں دمکتی ہے
ان کے عزم کے آگے
ظلم کی شہر پناہ
ریزہ ریزہ بکھرے گی
جبر کے بتوں کی سانس
لمحہ لمحہ اکھڑے گی
ان کے ماتھے کی شکن
وقت قرض لیتا ہے
بھوک بانٹنے والے
ظلم ڈھالنے والے
کیسے بچ کے نکلیں گے
وقت کی گذرگاہ سے
وقت کی گذرگاہ پر
یوم مئی کا قبضہ ہے

23-4-82

فلسطین

ہم سے مایوس مت ہونا اے دوستو
آج کی جنگ میں
ہم تمہارے لیے
ایک حرفِ دعا کے سوا
کچھ بھی نہ کر سکے
ہم کہ اپنے ہی شہروں میں محصور ہیں
ہم سے چھینے گئے ہیں ہمارے علم
اپنی ہی بیڑیوں میں گراں ہیں قدم
ہم سے مایوس مت ہونا اے دوستو
ایک دن
ان حصاروں کی بنیاد اکھڑ جائے گی
روز و شب کی گرانی گذر جائے گی
کل جب آراستہ ہوں گی تازہ صفیں
پرچم حرفِ جاں لے کے نکلیں گے ہم
دل پئے دوستاں لے کے نکلیں گے ہم
دست و بازو علم کرتے آئیں گے ہم

دشمنوں کے لہو میں نہائیں گے ہم
تم ہمارے لیے
ہم تمہارے لیے
ایک ہی صف ہیں اور ایک ہی آس ہیں

11-07-82

☆☆

اک ساعت کسی بھیگی ہوئی شب کی ساعت
تری یادوں کے خزانوں میں اترتی گذری

دل کی دھڑکن پہ سمٹتی رہی کرنوں کی چمک
روشنی طاقِ رگِ جاں سے بکھرتی گذری

یاد آئے کئی ڈوبے ہوئے مہتاب ہمیں
سامنے تاروں کی بوچھار برستی گذری

خوشبوئے پیرہن یار نہا کر نکلی
اس کی آواز کی جھنکار سنورتی گذری

ایک ساعت کسی بھیگی ہوئی شب کی ساعت

○

نہ دل کی دیت کوئی نہ کوئی جنوں کا صلہ
طلب کے دشت میں کیا بے نیاز ہیں ہم لوگ

تمام عمر لکھی آرزوئے مہر کے نام
ستارۂ شبِ ہجراں نواز ہیں ہم لوگ

یہی قبا تو ہمارے بدن پہ سجتی ہے
لہو لہو ہیں مگر دلنواز ہیں ہم لوگ

وہ گیت ہیں کہ جو زخمی لبوں پہ مچلے ہیں
فگار ہاتھوں میں دھرتی کا ساز ہیں ہم لوگ

☆☆

یہ گاؤں آ گیا سیلاب کی گذر گاہ میں
وگرنہ ہم کو بھی چاہت تھی ایک گھر رکھتے

حسن ناصر

اے شہرِ دل آرام
روشن ہیں جمالِ رخ رنگیں سے درو بام
انگڑائیاں لیتی ہوئی صبح ہے ترے نام
زلفوں کے گھنے سائے ہیں خوابیدہ تری شام
اے شہرِ دل آرام
اشک سرِ مژگاں کی نمی کا لئے پیغام
ہر دشتِ عقوبت میں سفر کرتا رہا ہوں
میں قلعہ لاہور سے بے نام لحد تک
ہر معرکہ عشق کو سر کرتا رہا ہوں
ہر گام لٹاتا چلا آیا ترے انعام
اے شہرِ دل آرام
نذریں ترے دربار میں لائے ہیں بہت لوگ
کچھ زخموں کے پیوند قباؤں پہ اجالے
کچھ دولتِ دشنام کے ہیروں کو سنبھالے
ہر نذر پہ کندہ مرے ناموں کے حوالے
ہر کوچہ و بازار پہ لکھا ہے مرا نام
بے مائیگیِ عشق پہ یہ بارشِ اکرام
اے شہرِ دل آرام

14-9-82

○

بے نور سمندر میں ہے گھر سائے کا
سورج کے مخالف ہے سفر سائے کا

قدموں کے تلے کوئلے بجھ جاتے ہیں
جل جاتا ہے جب کوئی نگر سائے کا

گھبرا کے کڑی دھوپ سے چل دیتے ہیں
جس سمت بھی ہوتا ہے سفر سائے کا

سوچوں کے ابلتے ہوئے چشمے لاؤ
ہے برف کی مانند اثر سائے کا

چلتا ہے تو ہر شے سے گذر جاتا ہے
اے عزمِ سفر سیکھ ہنر سائے کا

☆☆

اک ذرا سی بات تھی ایک موڑ پہ ملنا ترا
دور تک پھر قافلوں کے ساتھ افسانے گئے

جنہیں صبح تک تھا جلنا سرِ شام بجھ گئے ہیں
وہ چراغ کیا بجھے ہیں در و بام بجھ گئے ہیں

جو سحر کو جا رہے تھے وہ پیام بجھ گئے ہیں
شبِ غم ٹھہر گئی ہے ترے نام بجھ گئے ہیں

مری تشنگی کی نذریں کہیں قرض رہ نہ جائیں
لبِ مینا بے صدا ہے مرے جام بجھ گئے ہیں

کوئی کس سے سننے جائے کوئی اب کسے سنائے
کوئی روشنی کوئی خوشبو وہ کلام بجھ گئے ہیں

☆☆

ہزار سوختہ دل ہوں مگر چمن ہے عزیز
اٹھے نہ ہاتھ مرے برق کی دعا کے لیے

زمانہ ہو کہ نہ ہو سازگار کچھ بھی نہیں
ہمارے پاس بجز عشقِ یار کچھ بھی نہیں

ہمارے ہاتھ تو شل کر دئے ہواؤں نے
گریباں باقی ہے اور اختیار کچھ بھی نہیں

کسی کا چاک گریباں ازل سے ہے دنیا
یہاں جنوں کے سوا روزگار کچھ بھی نہیں

لہو سے آج کے لمحے کو سینچ لو ورنہ
کلی نہ پھول سرِ شاخسار کچھ بھی نہیں

اُڑھا سکیں نہ زمیں کو ردائے لالہ و گل
تو قتل گاہ میں اپنا وقار کچھ بھی نہیں

بستی کا شب کا سناٹا جھوٹا ہے
چور کا پھیرا ہو تو کم سوتے ہیں لوگ

طوفانوں کی فصلیں کاٹا کرتے ہیں
خاموشی کے بیج جہاں بوتے ہیں لوگ

زد میں ہو جو سر وہ اپنی خیر منائے
ہوا کے ہاتھوں میں پتھر ہوتے ہیں لوگ

کوچۂ جاناں یونہی تو گلنار نہیں
ناحق کب اپنی جانیں کھوتے ہیں لوگ

پھر کیا کیا سیلاب اُبل کر آتے ہیں
اپنی جبیں کی شکنیں جب دھوتے ہیں لوگ

بیت گئیں ساری ہی رتیں اک موسم زرد تھا
نہ یادوں کے زخم بھرے نہ دل کا درد تھا

ہم نے اکثر ایسے کاٹی تیری یاد کی شب
نہ آنکھوں کی جلن گئی نہ جھونکا سرد تھا

دل پہ دستک دے کے لمحہ بھر بھی نہ ٹھہرا
جانے کس بستی میں وہ آوارہ گرد تھا

زخم تو بھرتے ہی رہتے ہیں پر یہ یاد نہیں
کب زخموں کے بھرنے تک کوئی ہمدرد تھا

☆☆

اس سے بہتر نہیں نگراں کوئی ملنے والا
درد کو سونپ چلو دل کی نگہبانی بھی

ایک نظم ۴ اپریل کے نام

مرا لہو رائیگاں نہیں ہے
صفِ شہیداں کا وہ مزار ہوں
کہ جسکی مٹی کی تازہ خوشبو
ہوا کے جھونکوں میں بولتی ہے
میں وہ صلیب ہوں
جو آنے والی نئی منازل سے دور تک
قافلوں کو دکھائی دے گی
میں وہ علم ہوں کہ جسکا سایہ
ہر ایک صبح کے تازہ سورج کے ساتھ
بڑھتا ہے پھیلتا ہے
میں وہ صحیفہ ہوں حوصلوں کا
کہ جس کو کانٹوں کی وادیوں میں لکھا گیا ہے
میں روشنی ہوں کہ جو امر ہے
میں زندگی ہوں کہ جو فنا سے بلند تر ہے
کہ میرا جمہوریت کا پرچم
کروڑوں پرعزم بازوؤں کی بلندیوں نے اٹھا لیا ہے

نوٹ: 4 اپریل 1979ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تھی۔

شہید

میرا نام نذیر عباسی ہے
سامراج کے وردی پوش غلامو
غدارو دہشت گردو
میرے زخموں کو دہکا دو
میرے جسم پہ جال بنا دو
میرے لہو کی نہروں کا
گرم سلاخوں سے سینے پہ
جلتی ہوئی لکیریں کاڑھو
لیکن
میرے ہونٹوں سے اک لفظ اگر تم سن پاؤ
پھر تم جو پوچھو گے تم کو بتا دوں گا

12-7-83

○

مانوس ہے یہ شہر ترا ہم سے کچھ ایسا
کہ ساتھ ہمارے در و دیوار چلے ہیں

بولے ہیں تو تعزیرِ لب و نطق ملی ہے
سر لے کے چلے ہیں تو سرِ دار چلے ہیں

جب دھوپ نگل جائے گی دیوار کا سایہ
جائیں گے کہاں جو پسِ دیوار چلے ہیں

پرچم کے لیے جس کو ضرورت ہو وہ آئے
کچھ چاک گریباں سرِ بازار چلے ہیں

☆☆

پہلے بھی تم سے نکلے ہیں اس راہ سے قافلے
پہلے بھی تم سے دار پہ وارے گئے ہیں لوگ
جو عزم ہے تمہارا وہ ورثہ ان ہی کا ہے
پہلے جو قتل گاہوں میں مارے گئے ہیں لوگ

○

بلند رکھنا شہیدوں کی آبرو کے چراغ
ہوا کے دوش پہ بجھتے نہیں لہو کے چراغ

اُبھر رہا ہے کہیں آفتابِ صبحِ وصال
جلائے ہیں کہیں یاروں نے آرزو کے چراغ

چلو جو عہدِ جنوں استوار رکھتا ہو
بلا رہے ہیں سرِ دشت رنگ و بو کے چراغ

کھلے ہیں سینوں میں گل ہائے رنگِ جامِ مے
دلوں میں رہتے ہیں لو حسرتِ سبو کے چراغ

یہی ہے معجزہ نطق و لب سخندانوں
لہو کے شعلے سے جلتے ہیں گفتگو کے چراغ

1-10-83

☆☆

اُلجھے دھاگوں کا سلجھانا ایسا آساں کام نہیں
آنکھیں تھک کر رہ جاتی ہیں پوریں شل ہوجاتی ہیں

۱۳ نومبر

ظلم کی شب کو ہم خونچکاں کر گئے
ہم کہ حرفِ سحر تیغ جاں کر گئے

پرچمِ عشق لیکر پھرے کوبکو
جرأتِ عشق کو داستاں کر گئے

قبرِ گم گشتہ اپنا پتہ بن گئی
کُنجِ زنداں کو ہم آسماں کرگئے

سارے سکوں کو بے آب کرکے چلے
ہم جو سکہ لہو کا رواں کر گئے

شہر میں جب سے ہم تن فگاراں پھرے
شہر بھر کے لئے امتحاں کر گئے

آگ دہکا گئے پھول مہکا گئے
ہم لہو کا ہر اک فن عیاں کر گئے

نوٹ: 13 نومبر حسن ناصر کا یوم شہادت

کون رکھے گا اب قرضِ خاکِ وطن
ہم جوانی کو بارِ گراں کر گئے

جانفروشی کی زندہ روایت ہیں ہم
ایک جاں لے چلے کارِرواں کر گئے

13-11-84

☆☆

زندہ ضمیروں آگے کو بڑھتا ہر اک قدم
دشمن کے دل میں خوف کے مانند اترتا ہے
بجتی ہے ہتھکڑی تو شرارے نکلتے ہیں
کوئی شبِ سیاہ کا جگر چاک کرتا ہے

1985

○

تیری یادوں سے دیوار و در ضوفشاں
درد کی شام غم کی سحر ضوفشاں

سنگِ دشنام کا فیض جاری رہے
زخمِ تن داغ قلب و جگر ضوفشاں

شب نے ڈیرہ تو ڈالا بجھا نہ سکی
کوئی دل ضوفشاں کوئی گھر ضوفشاں

درد تقسیم کرتے چلو خلق میں
اس کی چاہت میں ہو سب نگر ضوفشاں

لرزشِ مے کے عنوان سے دمبدم
میکدہ سرخرو بام و در ضوفشاں

فیض احمد فیض

دلِ وحشی کو صدا دیتے ہیں جانے والے
لو چلے عشق کا آزار اٹھانے والے

اور کوئی کرے آرائش صحرائے جنوں
اٹھ گئے دشت سے ہم خاک اڑانے والے

اب کوئی اور حدیثِ غم جاناں لکھے
سوگئے ہجر کی شب عہد نبھانے والے

رقص مے ساز کی لے شورِ جنوں تیز کرو
نازش میکدہ کچھ رند ہیں جانے والے

ہم جو گزریں گے تو دیکھیں گے زمانے والے
یوں گزرتے ہیں تری راہ سے جانے والے

22-11-84

☆☆

ایک اعزاز دئے جاتے ہیں میّت کو مری
سرخ پرچم مرے مدفن پہ سجانے والے

○

دل کی اداسیوں سے کوئی باخبر نہ تھا
سب ساتھ چل رہے تھے کوئی ہمسفر نہ تھا

مانا ہر اک موج کا اپنا وجود تھا
لیکن سمندروں سے تو اس کو مفر نہ تھا

ٹکڑے مرے وجود کے بکھرے ہیں شہر میں
مجھ کو سمیٹ لیتا کوئی ایسا گھر نہ تھا

بستی کو میری لے گیا سیلابِ تشنگی
ایسا تو دیس دیس میں پیاسا نگر نہ تھا

گذری ہے خیر دل پہ خرابی بہت مگر
کچھ عشق میں دھیان ہمارا ادھر نہ تھا

مجبوریاں تو سچ یہ ہے سب ہی کے ساتھ ہیں
ہم جس کو چاہتے تھے وہ بیداد گر نہ تھا

نظروں کے سامنے سے کئی آسماں گئے
جس کی تلاش تھی وہ ستارہ مگر نہ تھا

20-9-85

۳۱ دسمبر

ایک سال اور گیا
زندگی
چند سال اور ترا ساتھ رہے
چند سال اور مرے
کوچہ یارِ طرحدار میں کٹ جانے دے
کوئے وحشیِ غم دلدار میں کٹ جانے دے
زلف کی خوشبو سراپا کا فسوں قامت رنگ
اور کچھ غنچے چٹک جائیں سرِ شاخ وصال
جام مے کنج چمن بادِ بہاری ٹھیرے
گردشِ وقت کی کچھ دیر سواری ٹھیرے
زندگی، تو نے مجھے
حسن فطرت دیا محبوب دیئے دوست دیئے
رنج و آلام دیا شہرِ پریشاں بخشا
تہمتِ عشق ملی دشتِ فروزاں بخشا
سجدۂ کفر ملا حاصل ایماں بخشا
اور میں نے تجھے

ترے ہنگاموں کی رونق کا تسلسل بخشا
گردشِ جام دوام مے و میخانہ دیا
شورشِ بربط و ساز دل دیوانہ دیا
چند سال اور ٹھہر
اک ترا قرض ہے وہ بھی ادا کر لینے دے
دشمنوں سے ترے اک جنگ ہے آغاز مری
فتح پا لوں تو چلوں
پیاس کے صحرا میں نہروں کی نئی فصل اگا لوں تو چلوں
بھوک کے کانٹے میں راہوں سے اٹھا لوں تو چلوں
آنے والوں کے لیے کھولوں درِ راہ نجات
اپنی نسلوں کو نئی راہ دکھا لوں تو چلوں
جنگ کے خوف سے جھلسی ہوئی اس دنیا میں
کھلکھلائے ہوئے غنچوں کو سجا لوں تو چلوں
میرے بچوں کو ابھی پڑھنا بھی ہے سادہ ورق لکھنا بھی
امن کی روشنی نگری میں اجالوں تو چلوں

نوٹ: 31 دسمبر شاہد رضوی کی سالگرہ۔

1986

○

ہم نے پہیوں کو رم آب رواں بخشا ہے
گونگے پرزوں کو بھی اک طرز بیاں بخشا ہے

ہم نے دیوزاد مشینوں کو زبانیں دی ہیں
عزمِ تعمیر میں بکھرے ہیں تو جانیں دی ہیں

یہ دھواں دیتی ہوئی چمنی کرینوں کی قطار
سنگ و آہن سے اٹھتی ہوئی اونچی دیوار

ریل کا جال عزائم کی طرح پھیلا ہوا
سرخ پگھلے ہوئے فولاد کا بہتا دریا

آگ سے کھیلتے ہاتھوں میں شرارے پالے
سرخ فولاد کے ڈھلتے ہوئے دھارے پالے

ہم نے طوفان کو ہاتھوں میں جکڑ رکھا ہے
زلزلہ انگلی کی پوروں میں پکڑ رکھا ہے

جو دیانت کا طلب گار ہو ہم سے سیکھے
عزم و جرأت جسے درکار ہو ہم سے سیکھے

کوئی للکار کے دیکھے تو ہمیں ہم کیا ہیں
ہم جو بپھرا ہوا طوفان ہیں چڑھا دریا ہیں

ظلم کی کوئی روایت نہیں چلنے دیں گے
جبر کے ہاتھ میں طاقت نہیں چلنے دیں گے

☆☆

شب تنہائی میں ڈھلتی ہے شام
کبھی بجھتی کبھی جلتی ہے شام

دید امید کی کلیوں کی طرح
غم کی شاخوں پر مچلتی ہے شام

دن کے دُکھ بوجھ مسافت کے تلے
لڑکھڑاتی ہے سنبھلتی ہے شام

کیسی برکھا برس گئی اب کے
بھیگ کر اور بھی جلتی ہے شام

○

انگ انگ سے نغمے جاگیں
تن میں پائل بجتی ہے

راہ چلے تو راہیں بہکیں
چال میں کیسی مستی ہے

بال ہوا میں یوں لہرائیں
اُٹھ کے ناگن ڈستی ہے

نیلی آنکھیں کالا کاجل
مدھ ماتوں کی بستی ہے

سینہ ہلکورے لیتا ہے
جیسے دھڑکن بجتی ہے

سارے تن پہ پھول کھلے ہیں
لب کلیوں کی بستی ہے

جیسے بوندیں پڑتی ہیں
یوں مہکار برستی ہے

جاگیں بانہیں سوئی بانہیں
نیند ہے جانے مستی ہے

شاید اپنا دل نہ ہوئے
اس پہ جو بندیا سجتی ہے

ہم کو جان بہت پیاری ہے
اس کے آگے سستی ہے

تین شعر

ستانا اگر ہے تو کڑی دھوپ میں ستاؤ
گرتی ہوئی دیوار کا سایہ بھی برا ہے

دستک تو ہر اک در پہ ہمیں دینی ہی ہوگی
ان گلیوں میں ہر در پہ ترا نام لکھا ہے

اس پل سے اتر آؤ گے تب دیکھ سکو گے
اک راستہ نیچے سے بھی بستی کو گیا ہے

اسکول کو جاتی ہوئی بچوں کی قطاریں
سڑکوں پہ مرے نیلے پرندوں کی اڑانیں

کوئل کی طرح کوکتے گاتے ہوئے بچے
بے بات یونہی شور مچاتے ہوئے بچے

چہکار ہے چڑیوں کی پپیہے کی صدا ہے
چہرے پہ مسرت کا ہر اک رنگ نیا ہے

پھولوں کو ہنسی آنے لگی ان کی ہنسی سے
کلیوں نے چٹکنے کا ہنر سیکھا ان ہی سے

الٹا کوئی چلتا کوئی دھکوں سے سنبھلتا
بیٹھا ہے زمیں پہ کوئی بھائی سے مچلتا

دوڑیں تو خوشی جھوم کے بل کھائے ہوا میں
رک جائیں تو خوشبو سی بکھر جائے فضا میں

یوں موڑ پہ ایک دم سے نظر آتے ہیں جیسے
جھاڑی سے نکل آتے ہیں تیتر کے پرے سے

1۔اسکول کا نیلا یونیفارم پہنے بچے

چہرہ پہ گلال اڑتا ہے وہ چھوٹ پڑی ہے
یوں لگتا ہے خوشیوں کی کہیں لوٹ پڑی ہے

بے فکر ہیں انداز غم کارِ جہاں سے
کچھ واسطہ رکھتے ہی نہیں سود و زیاں سے

ہر صبح یہ منظر جو مرا تازہ یقیں ہے
معصومیت انسان سے مایوس نہیں ہے

2-1-86

تین شعر

آدھے گھر میں دھوپ بھری ہے آدھے گھر پہ بادل ہیں
جانے کیسا موسم ہے دیوار و در سب گھائل ہیں

جانے تم نے کیوں سوچا اس پار ہو تو محفوظ ہو تم
دریا آخر دریا ہے ساحل زندہ ساحل ہیں

ہنسنا تو اک شغل ہے اپنا ورنہ ہم سے سارے لوگ
کچھ اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں کچھ اوپر سے گھائل ہیں

○

گر آج ساقی تہی دست ہے تو کیا غم ہے
ہزار جرعہ مے ناب خالی جام میں ہیں

نہ گذری آج کی شب کوئے یار میں نہ سہی
ہزار وصل کی راتیں کنارِ شام میں ہیں

ہیں زرد پتوں کے جنگل میں ساتھ ساتھ مرے
وہ آبشار رنگوں کے جو تیرے نام میں ہے

لہو سے لکھتے ہیں مقتل میں روبکاری عشق
جنوں کے کتنے سلیقے ہمارے کام میں ہیں

نشاطِ حوصلہ جاں کی بات مت پوچھو
یہ آبلے کڑی راہوں کے احترام میں ہیں

ایک شعر

کتنے بے بس ہیں آج بھی ہم لوگ
جی نہیں سکتے اک خدا کے بغیر

○

جل تھل کرنے والا بادل ایک اک بوند برستا ہے
شاید پانی مہنگا ہے اور پیاس کا صحرا سستا ہے

راہزنوں کے ہاتھوں لٹ کر ہم بھی کوئی خوش تو نہیں
لیکن یہ معلوم ہوا یہ رستہ سچا رستہ ہے

ایک دوجے پر ہنسنا تو اک رشتہ ہے انسانوں کا
اپنے آپ پہ ہنستے ہیں سب کون کسی پہ ہنستا ہے

اب بھی وہاں پروا چلتی ہے زخم ہرا سا رہتا ہے
دل کے جس گوشہ میں تیرے دکھ کا کانٹا بستا ہے

اس نے غرور دستِ قاتل اک لمحہ میں توڑ دیا
جس پر قامت دار سے اونچا فتح کا نعرہ سجتا ہے

صحرا کو گلشن کرنے کے ہم کو وطیرے آتے ہیں
جل تھل کرنے والا بادل ایک اک بوند برستا ہے

○

قامت سے نہیں ہے نسبت ان کو
سورج کے ہیں زاویوں سے سائے

سنجیدہ ہے کتنی کھیل میں موج
ساحل کو چھوئے اور لوٹ جائے

دہلیز پر انقلاب ہوگا
دروازہ کھولو کہ اندر آئے

رہزن کے مکاں پہ دیا ہے
رہرو سے کہو بہک نہ جائے

کیسا عجیب یہ سفر ہے
منزل میری راستے پرائے

سچ جھوٹ کی اک کسوٹی لاؤ
در آئے ہیں روشنی میں سائے

شہر میں کوئی نہیں، شہرِ خموشاں کے سوا
کوئی آواز نہیں، نالہ حرماں کے سوا

کوئی در کھلتا نہیں اب درِ زنداں کے سوا
آگ لگتی ہی نہیں ہے مرے داماں کے سوا

اب کوئی زخم نہیں زخمِ گلو کی مانند
اب کوئی چاک نہیں چاکِ دل و جاں کے سوا

ایسی جلتی ہوئی بستی ہے کہ ہم بھول گئے
گھر کسے کہتے ہیں جلتے ہوئے ساماں کے سوا

آشنا آنکھوں میں خوں جم سا گیا ہو جیسے
اب نظر ملتی نہیں ہے کسی پیکاں کے سوا

عصمت و عفت و ناموس تماشائے ہوس
زندگی امن محبت مگر انساں کے سوا

تر کیا ایسا لہو نے مرے غم خانے کو
کوئی شے خشک نہ چھوڑی سرِ مژگاں کے سوا

کس نے لوٹا مرا گھر میرا محافظ تھا وہ
کون قاتل تھا مرا مرے نگہباں کے سوا

تین شعر

نہ شامِ تشنہ لبی ہے نہ صبح خوش طلبی
ہمارے نام کے دن رات اب شہر میں نہیں

ہوائے تند کا غم ہے نہ فکر باراں ہے
مگر وہ قوت برداشت بام و در میں نہیں

وہی ہیں گرد سفر کی تہیں وہی چھالے
یہ اور بات کہ اب کارواں سفر میں نہیں

○

منزل کے تعین کے لیے ہم نے سفر میں
اس شعلۂ رخسار کو رکھا ہے نظر میں

پھیرا نہیں ہے جام کوئی زہرِ وفا کا
لو آبلوں کی بجھنے نہ دی رہگذر میں

اس کم گو کم آمیز کی یادیں بھی عجب ہیں
سب شور شہر کا سمٹ آیا مرے گھر میں

بے آب گزاری ہوئی صدیوں کی طلب ہے
دریاؤں کی پیاس آ گئی ہے سوکھے شجر میں

☆☆

ملی بھگت سے ہے واعظ کی کار میخانہ
یہ ضد دلاتا ہے ساقی شراب دیتا ہے

۱۱ ستمبر ۸۹ء

شہرِ داغِ زرِ گل
شہرِ صبا آوارہ
آج گیسوئے غمِ یار سے کیا ٹھیری ہے
ہجر سے ساعتِ دیدار سے کیا ٹھیری ہے
درد کی اجنبی یلغار سے کیا ٹھیری ہے
کوئے قاتل میں فروزاں ہیں شہیدوں کے علم
رنگِ گل، رنگِ حنا، رنگِ لہو کے پرچم
کوئے دلدار بھی ہے مجمعِ عشاق بھی ہے
ہم پہ کیا گذرے گی اغیار پہ کیا گذرے گی
کس کے سر جائے گی بازیِ وفا آج کے دن
نشۂ عشقِ جنوں کار پہ کیا گذرے گی
پھر وہ محشر ہے کہ ہاتھوں میں لئے فردِ عمل
جمع ہے مجمعِ آشفتہ سراں
پھر یہاں ہوتا ہے تقسیم حسابِ غمِ جاں
عارض و لب کے مہکتے ہوئے خوش رنگ گلاب
داغِ ہجراں کو صدا دیتے ہیں

کنجِ آغوشِ طرب کے حلقے
رنجِ افسردگیِ جاں کا صلہ دیتے ہیں
اب نہ ہوگا کہ وضعِ بندِ قبا کے نیچے
دلِ صد چاک سے نادیدہ لہو رستا ہو
اب نہ ہوگا کہ مرے دامنِ شب کے آنسو
جذب ہو نہ سکیں پلکوں پہ دکھائی بھی نہ دیں
اے مرے شہرِ جفا جو وطلبگارِ وفا
غمِ امروز و جمالِ فردا
آج اس مجمعِ عشاق سے کیا ٹھیری ہے
اور حسابِ غمِ بیباق سے کیا ٹھیری ہے

☆

نوٹ: 11 ستمبر 1989 کو ہنگری نے سوشلسٹ مشرقی جرمنی کے لیے اپنی سرحد کھول دی تھی۔ یہ کمیونسٹ بلاک کی تحلیل اور کمیونسٹ نظام کے مشرقی یورپ میں انہدام کی سمت ایک بڑا قدم تھا۔ 11 ستمبر کو ہنگری کے راستے مشرقی جرمنی کے بہت سے لوگ مغربی جرمنی میں داخل ہوئے۔ یہ دیوارِ برلن کے انہدام سے کچھ دنوں قبل کا واقعہ تھا۔

○

ساقی نہ رہا لطف و کرم کون کرے گا — اس دل کی گرانباری کا غم کون کرے گا

نہ طعنۂ واعظ ہے نہ ہے دستِ مسیحا — سینوں میں ترا دردرقم کون کرے گا

کون آئے گا سر لے کے سرِ راہ گذاراں — سامانِ غمِ عشق بہم کون کرے گا

کن ہاتھوں میں اترے گا وہ زہرابِ سرِ جام — اب پرورشِ لوح و قلم کون کرے گا

منت کشِ صہبائے ستم کون رہے گا — اب دشمنیِ اہلِ حکم کون کرے گا

مقتل کی طرف کج کلہی لے کے چلے گا — تقدیرِ ستم زیرِ قدم کون کرے گا

جب سرنگوں ہونے لگے رندوں کی انا بھی — پھر حرمتِ مے خانہ علم کون کرے گا

○

ازل ہے نہ ابد ہے اک سفر ہے / کہ ہر منزل نشانِ رہگذر ہے

سفر تو ہے مگر کیسا سفر ہے / وہی رہزن ہے وہ ہی راہبر ہے

نقابوں کا یہ کھیل اب بے اثر ہے / وہ چہرہ آج بھی نا معتبر ہے

ہے اس بستی میں یہ شرطِ رہائش / مری چوکھٹ مرے ہی خون سے تر ہے

یہ ہنگامہ فرو ہو تب تو پہنچیں / اسی راہ میں کہیں اپنا بھی گھر ہے

نہ جانے دھوپ کیوں دشمن ہوئی ہے / یہاں کرنوں میں تیروں کا اثر ہے

بہاروں کے لیے دکھ سہنے والا / کسی صحرا میں اب بھی در بدر ہے

خزاؤں کے قصیدے لکھنے والا / بہار آئی تو اب دستِ ہنر ہے

غرور اس کا رہے قائم ہمیشہ / وگرنہ حسن تو حسنِ نظر ہے

○

کیا کام دیں گی میری ستارہ شناسیاں
تاریک بادلوں سے ڈھکے آسمان میں

آؤ اگر تو کوئی سہارا نہ ڈھونڈنا
اب بام و در نہیں ہیں ہمارے مکان میں

پانی پیا تو پیاس سم آلود ہوگئی
کانٹے سے اگ رہے ہیں ہماری زبان میں

جز اطمینانِ قلب کوئی چارہ ہی نہیں
سب لوگ رہ رہے ہیں شکستہ مکان میں

☆☆

میں نے وہ آگ پی لی ہے
پتھر چھو جائیں تو لو دیں گے

○

گو کم نہیں ہونے کا جو آزار بہت ہے
اک حرف تسلی ہمیں درکار بہت ہے

قیمت نہیں ملے گی متاع دلِ و جاں کی
بازار ہے کم شورشِ بازار بہت ہے

آواز دے اے قافلہ درد نشیناں
سناٹا سر کوچۂ دلدار بہت ہے

پھر آج ہے شاید کسی عیسیٰ کا تماشہ
ہنگامۂ احباب سرِ دار بہت ہے

اس دل کے قرین ٹھہر گیا ہے کہیں آ کر
وہ ہجر کا موسم سہی، غم خوار بہت ہے

گلشن کے ہر اک رنگ کا اقرار بہت ہے
اور میرے لہو سے اسے انکار بہت ہے

○

ٹوٹے گی یا کوئی نئی زنجیر بنے گی
جانے مستقبل کی کیا تصویر بنے گی

خواب میں، میں نے زخمی پرندے دیکھے ہیں
جانے میرے خواب کی کیا تعبیر بنے گی

کوئی کہے کچھ دل میں پیار جگائے رکھنا
عالم عالم یہ ہی اک تنویر بنے گی

یہ کشتی دریا جیسی شوریدہ سر ہے
یہ کشتی تو موجوں کی تقدیر بنے گی

چاہت کا صحرا بھی کیسا صحرا ہے
خاک اڑاؤ تب دل کی تصویر بنے گی

تیز ہواؤں کو کوئی الزام نہ دینا
دئے بجھے تو آنگن کی تقصیر بنے گی

21-1-91

○

دلوں پہ رسم تقاضائے دلبری کے لیے
سنوارے کوئی دن عاقبت گریباں کی

نکھارے سرِ راہے نگاہ خوں گشتہ
اتارئے کوئی تصویر رقصِ زنداں کی

صدائے شورِ سلال سرورِ دار و رسن
سلامتی کی دعائیں ہیں کوئے جاناں کی

اٹھائے سرِ میخانہ زہرِ عشق کا جام
بنامِ حرمت و توقیر جانِ گذراں کی

☆☆

ایسا معمار کہ تعمیر سے تھکتا ہی نہیں
وقت کے ہاتھ میں تکمیل کا لمحہ ہی نہیں

☆☆

تمام عمر ترا انتظار کرتے رہے
وہ انتظار کہ جسکا کوئی سبب ہی نہ تھا

○

ہوا کے ہاتھ میں بے دست و پا ہے — ستم یہ ہے کہ وہی قبلہ نما ہے
دلوں کو توڑ کر یاں گھر بنے ہیں — گھروں کو کاٹ کر رستہ گیا ہے
مداراتِ غم دنیا بھی ہوگی — مگر اک قرض اس بے مہر کا ہے
مرے دشمن کا حامی ہوگیا ہے — اِدھر میں ہوں اُدھر میرا خدا ہے

☆☆

اک شخص کہ تھا نقطہ آغازِ محبت
ہر شے میں اسی شخص کا سایہ نظر آیا

☆☆

ترکِ تعلقات کے اس حادثہ کے بعد
میں سوچتا ہوں زندگی آسان ہوگئی

○

اک دھڑکتا ہوا دل لے کے چلے آئے ہو
اس خرابے میں ہیں آباد صنم پتھر کے

آج جی چاہتا ہے مرثیہ لکھیں اپنا
روشنائی ہو لہو کی تو قلم پتھر کے

اک بارش میں کھنڈر ہوگئی ساری بستی
اب کے برسے ہیں جو بادل نہ تھے کم پتھر کے

ان ہواؤں میں تو انجام یہی ہونا ہے
تم بکھر جاؤ گے ہوجائیں گے ہم پتھر کے

☆☆

باہر نکلیں گھاس پہ ننگے پیر چلیں
بہت دنوں سے ہم کمروں کے اندر ہیں

☆☆

نہ ہم سفر کوئی نہ کہیں سایہ شجر
کوئی نہیں کہ شکوہ درماندگی کریں

○

آستین پہ کوئی دھبہ ہے نہ دامن پہ ہے داغ
کیسے پائے گا کوئی اب مرے قاتل کا سراغ

ڈھونڈنے نکلے تو اک نقش کفِ پا بھی نہیں
سننا چاہے تو کہیں قتل کا چرچا بھی نہیں

کھو گیا میرا لہو جس کی نہ منزل نہ نشاں
نہ سرِ خاک عیاں ہے نہ تہہ خاک نہاں

روشِ گل کو پتا ہے نہ صبا کو معلوم
دمِ عیسیٰ کو خبر ہے نہ دعا کو معلوم

نہ کسی درد کو ہے دستِ مناجات کی آس
نہ کسی زخم کو اعجاز مسیحا کی تلاش

جانے کیا گذری کے تڑپا ہے نہ مچلا ہے لہو
جانے کس کرب کے سناٹے سے گذرا ہے لہو

صفِ عشاق نہیں، مجمع اغیار نہیں
دل زدہ کوئی نہیں کوئی وفادار نہیں

سرنگوں ہے کوئی سر اور نہ سرافراز کوئی
دستِ قاتل کے سوا اب نہیں دمساز کوئی

30-7-91

☆☆

غربتیں زندگی کی ساتھی تھیں
موت کا ساتھ بیکسی نے دیا
یہ ترا قتل کس کے نام لکھوں
ایک درندہ اک آدمی یا خدا

○

حسن اگر آہنگ محض ہے پھر کیوں اچھا لگتا ہے
بھیگا کاجل بکھرے گیسو رخساروں کے بہکے رنگ

بانہوں کی وہ نرم گھلاوٹ ہونٹوں کی چپ چپ مسکان
جھلمل کرتی آنکھ کی جوتی عارض دہکے رنگ

جیسے اڈ کر آئے گلابی جیسے ٹوٹا جائے بدن
جانے کس نے چھیڑ دیا ہے بول اٹھے رہ رہ کے رنگ

شوخی گل میں خلوتِ دل میں جام مے میں بند قبا میں
کھل جائیں چپ رہتے رہتے، چھپ جائیں کچھ کہہ کے رنگ

☆☆

عشق کا کاروبار حیرت ہے
وہ جو نقصان ہے نفع ہے وہی

☆☆

منزل کار ہوس ایسی کٹھن تھی رضوی
جو قدم ہم کو بڑھانا تھا بڑھایا نہ گیا

○

اپنے گھر کے آگے سے اس طرح سے گزرے ہم
جیسے اسمیں ہم نہیں کوئی اور رہتا ہے

کس بلا کی تلخی ہے اس کی مسکراہٹ میں
اتنا زہر پی کر وہ کیسے زندہ رہتا ہے

کس قدر منافق ہیں لوگ تیری بستی کے
چہرا دیکھ کر ہر ایک سچ کو جھوٹ کہتا ہے

کیا عجب سماں ہے یہ جل رہا ہے سب جنگل
اور بیچ اک دریا تند و تیز بہتا ہے

☆☆

جسم کا سارا لہو لگ جائے
تب کہیں شعر میں رنگ آتا ہے

○

اک عمر بعد بھی ہمیں راحت نہیں ملی
وہ مل گیا تو اس سے طبیعت نہیں ملی

ہم بھی تو دیکھتے کہ وہ کتنا بدل گیا
افسوس ہم کو رکنے کی فرصت نہیں ملی

محفل سے تیری نکلے تو دنیا تھی منتظر
ہاں پھر وہ اضطراب وہ وحشت نہیں ملی

دل بیچنے چلے تو خریدار نہ ملا
جاں بیچنے کو نکلے تو قیمت نہیں ملی

ملنے کو ترے شہر میں کس کس سے نہ ملے
یہ اور بات ہے تری صورت نہیں ملی

تھک کر رکے تو چلنے کی ہمت نہیں پڑی
اور چل پڑے تو رکنے کی فرصت نہیں ملی

کس طور وضع اہلِ محبت نبھائیں ہم
مدت سے دوستوں سے عداوت نہیں ملی

اک بات تم سے کہنا تھی ہم کو نہ کہہ سکے
افسوس بات کرنے کی فرصت نہیں ملی

☆☆

زخم کی پُرسش تم نہ کرنا
بھرنے لگے ہیں دل کے گھاؤ

یارو مدت بعد ملے ہو
اس کی کوئی بات سناؤ

جائے کہاں تک شعلہ دیکھیں
بھڑکے تو یادوں کا الاؤ

ہم تو آگ کے حلقے میں ہیں
جلنا ہو تو تم بھی آؤ

○

رشتوں میں گرمی نہ ہو تو پھر گھر سے بازار بھلا
دکھ سکھ میں جو کام نہ آئے پھر وہ کیسا یار بھلا

نفرت کرنا تو آساں ہے جب چاہو تب کرلینا
مشکل تو یہ کام بہت ہے کرکے دیکھو پیار بھلا

تم پر مرنا جگ میں پھرنا اپنا سواد اسی میں ہے
سود و زیاں کی بات نہ پوچھو ہم کو یہ بیوپار بھلا

تم سے رسم و راہ بڑھانے میں اک مدت صرف ہوئی
ترکِ تعلق بھی کرلیں گے جلدی کیا ہے یار بھلا

کچھ عہد وفا کے رشتے تھے کچھ ترکِ وفا کے ناتے تھے
ان گلیوں میں ان کوچوں میں اس نام پہ آتے جاتے تھے

کب ہم نے قیمت مانگی تھی کیوں بستی کے در بند کئے
ہم سوداگر امیدوں کے ہم خواب لٹانے آتے تھے

وہ گوہر شب آنکھیں نہ رہیں وہ مشعل جاں بے نور ہوئی
ہم جن سے اندھیری راتوں میں لوگوں کو راہ دکھاتے تھے

ہے خواب وہی امید وہی بس فرق یہ آج اور کل میں ہے
اب خود کو دلاسہ دیتے ہیں کل سب کی آس بندھاتے تھے

☆☆

سنا تو تم نے بھی ہوگا کہ کھو گئے فرعون
کسی ہجوم میں پامال نقشِ پا کی طرح

آتی ہے یاد آتشِ و رخسار و لب کی لو
ہوتا ہے اب بھی دل میں چراغاں کبھی کبھی

تھی قرض آبروئے قفس قیدیوں کے نام
خود بند کرلیا درِ زنداں کبھی کبھی

ہوتا ہے یوں بھی طاقتِ پرواز دیکھنا
ہوتی ہیں سمتیں ساری گریزاں کبھی کبھی

جب ضبط انتظار سے بولا گیا ہو دل
کرتے ہیں یونہی چاکِ گریباں کبھی کبھی

☆☆

اس لمحے کی گرفت میں تھی ساری کائنات
جب تجھ سے سرراہ ملاقات ہوئی تھی

☆☆

مرنے کی تمنا کو بھی جینے نہیں دیتی
کیا کیا ہیں سلیقے تیری بیداد گری کے

چاک دل لے چلے چشم تر لے چلے
راہ لمبی ہے زادِ سفر لے چلے

آسماں کی وقعت کیا ہمارے لئے
ہم کہ کارِ زمیں اپنے سر لے چلے

چشم حسرت زدہ دیکھتی ہی رہی
اور سیلاب سب بام و در لے چلے

رسم زاد سفر بھی نباہتے رہے
لوٹنے کے لئے راہبر لے چلے

آئینہ کی طرح جو نہ خود بیں ہوا
اک دلِ بے خبر عمر بھر لے چلے

پیرہن پھر لہو سے چپکنے لگا
پھر تقاضائے خونِ جگر لے چلے

جب تلک دوستو ہجر کی شام ہے
عشق بس عشق ہی معتبر نام ہے

سیکڑوں بار مے اس سے پی جائے گی
دیکھنے میں محض ایک ہی جام ہے

لذتِ ہجر و وصل عشق کا کھیل ہے
لطف ہیں سینکڑوں ایک ہی نام ہے

جا رہے ہیں وہاں دیکھیے کیا بنے
اک بیدادِ گر سے ہمیں کام ہے

☆☆

جب کبھی اس کی یاد آتی ہے
سانس کانٹوں میں الجھ جاتی ہے

☆☆

وہ آج اجنبی کی طرح راہ میں ملا
ہم جانے کتنی دور اسے دیکھتے رہے

تھی فکر روزگار جو فکر وصال ہے
سر تو ہمارے دوش پہ اب بھی وبال ہے

خنکی ہوا کی ابر کا سایہ اور آبجو
گو وہ نہیں ہے پھر بھی طبیعت بحال ہے

ہم تو یہاں نہ تھے پہ وہ آیا ضرور تھا
خوشبو کا رنگ اب بھی فضا میں گلال ہے

کیا رنگ لائیں جانے سمندر کی کاوشیں
دریا کی کاوشوں کا سمندر مآل ہے

مدت ہوئی ہے رضوی سے ہم کو ملے ہوئے
کہتے ہیں لوگ ویسا ہی آشفتہ حال ہے

☆☆

برسوں سے میں جس کا منتظر ہوں
وہ شخص آج بھی نہ آیا

شب فراق ہے امید صبح وصل کے ساتھ
خزاں کے پیچھے بہاروں کا قافلہ بھی ہے

تمہارے کوچہ تک ہے راہ ناوک و دشنام
پھر اور کچھ نئے زخموں کا سلسلہ بھی ہے

ہے چند گام مرے گھر سے دشتِ وحشت بھی
مگر یہ دست و گریباں کا فاصلہ بھی ہے

میں سجدہ اے رخ رنگیں جمال کر تو لوں
مری انا کا مگر ایک مسئلہ بھی ہے

☆☆

اس کو اس راہ سے گزرے ہوئے مدت گزری
پھر بھی اس راہ پر ہم رک کے چلے بہکے بھی

☆☆

امتحان قلب و نظر کا سحر و شام میں ہے
کچھ غم یار میں کچھ کلفت ایام میں ہے

○

حسن ترتیب ہے اجزائے بہاراں کے بیچ
جتنا نکھرا ہوا ہوتا ہے نشہ دیتا ہے

رنگ اُڑا بال کھلے آنکھ میں نم رخ حیراں
یہ جو محشر ہے مرے دل کا پتہ دیتا ہے

دل زدہ کوئی مسافر تو نہیں لوٹ آیا
پھر کوئی شخص ترے در پہ صدا دیتا ہے

کام رہبر کا ہے سمتوں کا تعین کرنا
خارِ رہ کا تو پتہ آبلہ پا دیتا ہے

قافلہ کیسی جگہ اس نے اتارا لاکر
راہزن بھی مرے رہبر کو دعا دیتا ہے

☆☆

تیرے حسن کی چاہت دل میں پہلے پہل بیدار ہوئی
آخر آخر ساری دنیا میرے دل کا پیار ہوئی

○

تھمتا نہیں پیمانہ کبھی گردش مے سے
منزل نہیں ملتی ہے کبھی باد صبا کو

تا حد نظر رکتی نہیں موج کی رفتار
اور آب رواں دیکھے ہے دریا کی ادا کو

پھیلے ہے بوئے گل چمن و دشت و بیاباں
پابند کوئی کرتا نہیں رنگِ حنا کو

طوفان کی آواز تو میلوں نہیں رکتی
پابند سلاسل نہیں صرصر کی صدا کو

آئینہ کا عکس آئینہ میں لامتناہی
رکھا ہے تسلسل نے بہاروں کی فضا کو

تھا پہلے ہی گل پوش نگہت بیز چمن رنگ
کچھ حسن نے وارفتہ کیا اس کی ادا کو

روکے نہیں رکتا ہے جمال رخ رنگیں
ہے خوئے ہمہ گیر اس انداز و ادا کو

منزل نہیں ہوتی ہے سرِدشت تمنا
پابند حنا کس نے کیا آبلہ پا کو

روکا نہیں جاتا ہے کبھی قافلہ وقت
ہو کون عناں گیر تغیر کی ادا کو

ٹھیری نہیں اک آن سمندر کی روانی
بھولا نہیں اک لمحہ بھی ساحل کی جفا کو

اس طرفہ تسلسل پہ بھی قانع نہیں فطرت
ہر چہرے پہ اوڑھے ہے تغیر کی ردا کو

ہر گام پہ اک منزل نو اس کی نظر میں
یہ آبِ بقا دیتی ہے خود آبِ بقا کو

☆☆

عشق میں فرصت یک لمحہ نہ پائی ورنہ
سوزش زخمِ جگر کا بھی مداوا کرتے

نہ ذہن یکسو نہ دل کو قرار رکھتے ہیں
ہم اپنی گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

ہر ایک جام پہ کہتے ہیں ہم سبحان اللہ
خیال شیخ حرم بار بار رکھتے ہیں

ہم اپنی ماضی کی قربانیوں پہ جیتے ہیں
بجھے چراغ پہ ہم انحصار رکھتے ہیں

لہو سے داغوں سے زخموں سے کرکے تخمینہ
حساب آمد فصل بہار رکھتے ہیں

☆☆

شاید وہی تکمیل تمنا کی گھڑی تھی
جب تیرے سراپا پہ نظر اپنی پڑی تھی

☆☆

ہر ڈھنگ سے تو ہم نے کیا عرض مدعا
یا مانتے نہیں یا برا مانتے ہیں آپ

○

هم بہت دل اداس رکھتے ہیں — اس سے ملنے کی آس رکھتے ہیں

اک تحیر کی زندگانی ہے — دل کو عالم شناس رکھتے ہیں

ایک دنیا کو دھوکہ دینے کو — خضر کا سا لباس رکھتے ہیں

بس یہ موسم بھی راس آجائے — ساغر و مے تو راس رکھتے ہیں

جاؤ تم کو جفا پہ معاف کیا — ہم بھی احساں کا پاس رکھتے ہیں

☆☆

اس قدر اختیار حاصل ہو
پھر تو آسان ہے خدا ہونا

○

صرف آرائش گلشن میں لہو ہونا ہے
پھر مرے چاک گریباں کو رفو ہونا ہے

اک ذرا اہل زمانہ سے تو فرصت پالیں
ہم کو بھی غرقِ مے و جام و سبو ہونا ہے

ہم نے جو رسم جنوں کی ہے چمن میں آغاز
رفتہ رفتہ اسے آئینِ نمو ہونا ہے

گرم ہوتی ہے فضا حلقہ آتش کے قریب
تلخی ذہن کو تو وقت کی خو ہونا ہے

☆☆

خیر مناؤ جس دن دریا اپنے کنارے توڑ بہے
ابھی تو دریا اور بستی کے بیچ کنارے حائل ہیں
موجوں کی قربانی سے دریا کا تشخص بنتا ہے
موجیں گر خود کو نہ گنوائیں دریا مردہ ساحل ہے

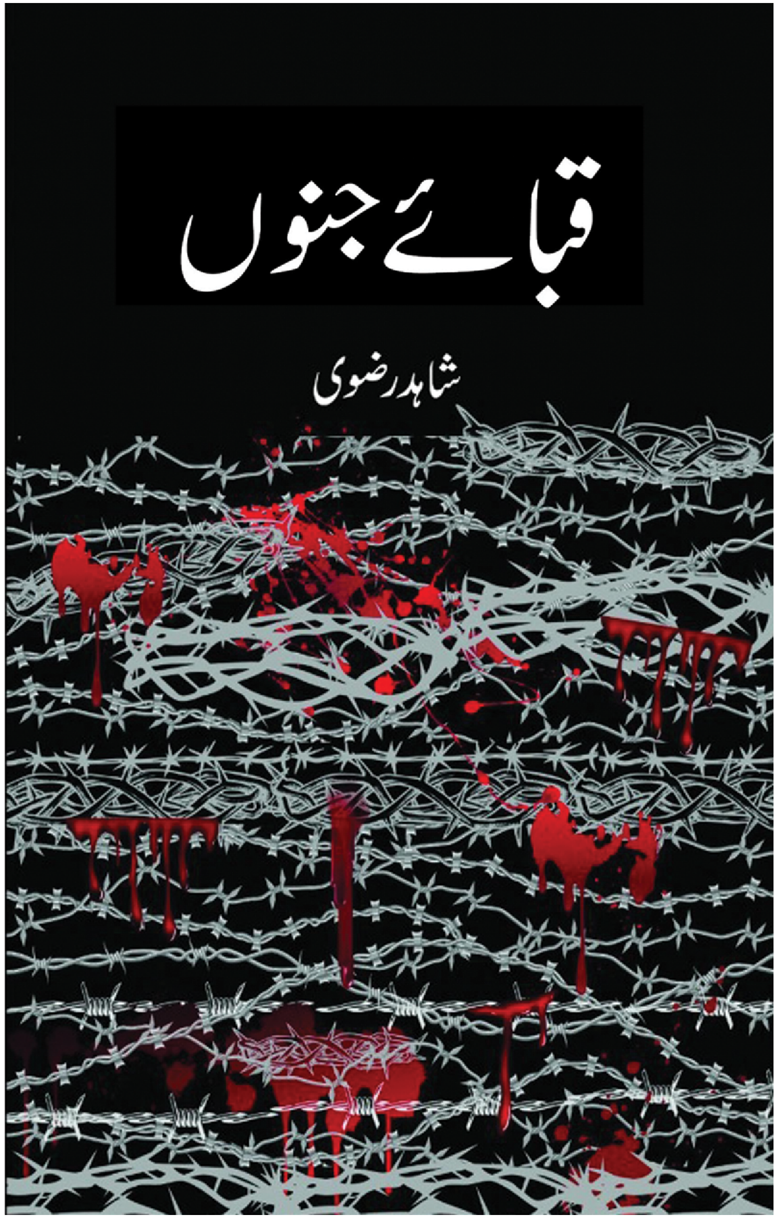
قبائے جنوں
شاہد رضوی

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہَوا کہتے ہیں

غالبؔ

ڈھانپے ہوئے قبائے جنوں سے فشارِ دل
ڈھونڈا کئے ہیں ہم بھی مسیحا کبھی کبھی

شاہد رضوی

فہرست

☆......ہم خبر دیتے ہوئے نام بنام آئے ہیں ۲۱۳

☆......کچھ تجھ کو بھی خبر ہے کہ کیا پوچھتے ہیں لوگ ۲۱۴

☆......مزدوروں کی فتح کا سورج ۲۱۵

☆......یہ ہجر و وصل صنم نہیں ہے یہ قصہ بیش و کم نہیں ۲۱۷

☆......کرتے ہیں گراں نرخِ غمِ یار دیکھنا ۲۱۸

☆......شہروں شہروں پھرتے پھرتے ہم بھی رسوا خوب ہوئے ۲۱۹

☆......سات جون کی تاریخ ۲۲۰

☆......رک جائیں تو ٹھیرے ہوئے طوفان میں ڈھل گئے ۲۲۱

☆......میرے لہو نے راہوں میں روشن کیے الاؤ ۲۲۲

☆......شاید ہیں قریب منزلوں سے ۲۲۳

☆......ہونٹوں کی پیاس دل کی جلن جسم کی تپش ۲۲۴

☆......اہل دانش زنداں میں ہیں خیر نہیں دیوانوں کی ۲۲۵

☆......نہ سہی کوئی یہاں تیرا شناسا نکلے ۲۲۵

☆......عشق کا دعویٰ کرتے ہو اور دل پہ کوئی داغ نہیں ۲۲۶

☆......دعویٰ ہے فیضِ عام بھی ہے پابندی گردشِ جام بھی ہے ۲۲۷

☆......ہاں اے نفس سوختہ اک طرزِ فغاں اور ۲۲۸

☆......ستا رہی ہے ستم گر کو آرزو میری ۲۲۹

☆......کچھ نئی بات نہیں تم نے کہی ہے یارو ۲۳۰

☆......جلنے لگے ہیں پاؤں بگولوں کا رقص ہو ۲۳۱

☆......کھلا ہوا تھا در میکدہ پہ ہم نہ گئے ۲۳۲

☆......دل تو کبھی بھی خوگرِ دست جفا نہ تھا ۲۳۳

☆......ہوا زمانہ کہ گذرے تھے سر بلند کیے ۲۳۴

☆......میرا لہو ۲۳۵

☆......یقین ہے تو صفوں میں قدم ملا کے چلے ۲۳۷

☆......ہجوم عاشقاں میں گم بھی ہوں سب سے نمایاں بھی ۲۳۸

☆......جلنا مرا نصیب ترے عہد میں سہی ۲۳۹

☆......ایک لڑکا کہ جس کے چہرے پر ۲۴۰

☆......دیتے ہیں سزا یوں کہ نہ جرم ہے نہ خطا ہے ۲۴۱

☆......سر بزم شہیداں رقصِ بسمل آج بھی ہوگا ۲۴۲

☆......جون بہتر کی تاریخ نے ۲۴۳

☆......حسن ناصر ۲۴۴

☆......نہ بجھا سکے اندھیرے مری سوچ کے ستارے ۲۴۶

☆......طوق و زنجیر پہن کر بھی صدا دیتے ہیں ۲۴۷

☆......جلتے رہے چراغ تو احساس کسے تھا ۲۴۸

☆......جہاں جہاں سے کوئی شاخ گل قلم ہوگی ۲۴۹

☆......سیاہی سمٹی چلی آ رہی ہے زنداں کی ۲۵۰

☆......یہ منصفوں کا مرے فیصلہ ہے کیا کہیے ۲۵۱

☆......حق ایسے ملے ہیں ترے آئین کرم سے ۲۵۲

☆......سچ یہ ہے کہ غم درپئے آزار نہیں ہے ۲۵۳
☆......نیزے شعاع مہر کے دل میں انی ہوئے ۲۵۴
☆......دل پہ تنہائیاں ایسی کہ مٹا بھی نہ سکوں ۲۵۵
☆......وہ شخص گر حاکم کا طرفدار نہ ہوتا ۲۵۶
☆......در پردہ لوگ درپئے آزار ہو گئے ۲۵۷
☆......نکلی ہو بجھانے جنہیں اے تیز ہواؤں ۲۵۸
☆......کوئی منصور سردار یہاں آیا تھا ۲۵۹
☆......انسانیت کی منزل آخر حسین ہے ۲۶۰
☆......نیا آئین ۲۶۱
☆......کربلا، کربلا ۲۶۳
☆......ہماری سعی مسلسل کا یہ صلہ ہوگا ۲۶۵
☆......جاگی ہوئی شب ۲۶۶
☆......احساس عظمتِ انساں ہو جب عام تو کوئی بات بنے ۲۸۶
☆......کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ۲۶۹
☆......کام مشکل تھا، غمِ عشق سے آساں نکلا ۲۷۰
☆......جھوٹ کے شہر میں ۲۷۱
☆......ظرف اہل وفا نبھادیں ہم ۲۷۲
☆......سر بازار ہو کہ مقتل ہو ۲۷۳
☆......تیری شہرت بھی بہت اور میں رسوا بھی بہت ۲۷۴
☆......نہ کوئی وصل کی ساعت نہ کوئی ہجر کی رات ۲۷۵
☆......پھر ہر اک زخم لہو دینے لگا ہے یارو ۲۷۵
☆......نہ کھل سکیں گی اگر کھڑکیاں تو ٹوٹیں گی ۲۷۶

☆......حصار جسم وزماں ومکاں کی بات نہیں ۲۷۷
☆......اس عہد کے سب زخم سجے ہیں میرے تن پہ ۲۷۸
☆......جاڑوں کی پہلی بارش نے ۲۷۹
☆......اب جنگ نہ ہونے دیں گے ۲۸۰
☆......سورج گہن ۲۸۱
☆......دریا خشک نہ ہو سیلاب اگر آتا ہو آئے ۲۸۲
☆......کہیں سے پھولوں کی خوشبو کہیں سے رات چلی ۲۸۳
☆......تیز ہواؤں نہ بجھا پاؤ گی تم سارے چراغ ۲۸۴
☆......بانہوں میں بانہیں ڈال کے دونوں سفر کریں ۲۸۵
☆......اس نے سچ کو چھوا ۲۸۶
☆......جاتے جاتے اس منزل پہ پیڑ ہم اک بو جائیں گے ۲۸۸
☆......ذہن پر اتنا دباؤ شہر میں اس درجہ حبس ۲۸۹
☆......مانوس جسم ذہن شناسا کا عشق ہے ۲۹۰
☆......یارو لہو جلاؤ اجالا تو رہ سکے ۲۹۱
☆......بلندیاں جو سفر اختیار کرتی ہیں ۲۹۲
☆......اک نہ اک میرا سہارا ہی سہی ۲۹۳
☆......مجھے بہلاتے ہو جب کہتے ہو کل آؤ گے ۲۹۴
☆......کچھ تذکرۂ دردحکایات کیجیے ۲۹۵
☆......قحطِ یاراں میں پکاریں کس کو ۲۹۷
☆......دیارِ دل میں کوئی احتیاط کیا کرتے ۲۹۸

☆......جان پر کھیل گئے ہم ۲۹۹
☆......اے بخیہ گرو! ۳۰۰
☆......وہ آواز ۳۰۱
☆......میری خواہش ہے کہ اس دور کا انسان دیکھوں ۳۰۲
☆......کیسے خوابوں کی سرزمیں پہ ہوں ۳۰۵
☆......مہکے گا کہیں زخم کہیں پھول کھلیں گے ۳۰۶
☆......سمندروں میں جو طوفان سر اٹھائیں گے ۳۰۷
☆......بیروت کی ایک تصویر ۳۰۸
☆......جھونکا تازہ ہوا کا کہہ گیا ہے ۳۰۹
☆......مجھ کو دس سال کی زنداں کی سزا دیتے ہو ۳۱۰
☆......بازاروفا آج طلبگاروفا ہے ۳۱۱
☆......ساتھیو اٹھو ۳۱۲
☆......ہوا کے شور میں آواز پا سنائی دے ۳۱۵
☆......ابھی تو چاک گریباں میں تار باقی ہے ۳۱۶
☆......اک مست کی ٹھوکر کے آگے سب شیشے کے گھر پتھر تھے ۳۱۷
☆......بجھ گیا ہے چراغ حسرت دید ۳۱۸
☆......دل کی اداسیاں بھی نیا وار کر گئیں ۳۱۹
☆......ایک گم گشتہ کھلونے کا سا احساس لیے ۳۲۰
☆......دعا کرو کہ سلامت رہے جنوں کا وقار ۳۲۱
☆......نہ مجھ کو فکر ہے اسکی نہ اس کو میری فکر ۳۲۲

☆......اس درد کے لاکھوں پہلو ہیں اتنے کہ بتا نہ پائیں ہم ۳۲۳
☆......خوشبوئیں جانی پہچانی رنگ انجانے لکھے ہیں ۳۲۴
☆......زندگی بھی عجب تماشا ہے ۳۲۵
☆......جس کا جی چاہے نہ جائے ۳۲۶
☆......ہیں طلسم امید سے زندہ ۳۲۷
☆......تھی گفتگو بھی مگر آئیں بائیں شائیں رہی ۳۲۸
☆......جانے کیا شے ہے عکس آئینہ ۳۲۹
☆......جانے کب سے لگائے ہوئے ہے ۳۳۱
☆......میرے بچے ۳۳۲
☆......رندوں سے توقع نہ تھی آزردہ سخن کی ۳۳۴
☆......پھر عظمت انساں میں کیا باقی رہے گا ۳۳۵
☆......اس ترک تعلق کا تعلق بھی عجب ہے ۳۳۶
☆......میرے پیتے ہی سر جام جگہ خالی ہوئی ۳۳۷
☆......کیسی آسان بجھاتی ہے ہوا ۳۳۸
☆......تر کر کے جو آتے تھے گریباں کو لہو سے ۳۳۹
☆......کچھ اب کے بیاباں سے غزالاں بھی ہیں ناخوش ۳۴۰
☆......جہاں جہاں بھی سفر میں نے اختیار کیا ۳۴۱
☆......تسخیر کی منتظر ہے فطرت ۳۴۲
☆......غم آوارگی سے ملتی ہے ۳۴۳
☆......یہ گرد سفر نہیں سفر ہے ۳۴۴

☆......بیکار ہیں سب رسل ورسائل کے طریقے ۳۴۵
☆......بیچ سے لوگوں کا ایک ریلا گیا ۳۴۶
☆......مے کدے میں جگہ نہیں نہ سہی ۳۴۷
☆......یوں بھی ہوتا ہے کہ ملنے سے سوا ہوتا ہے ۳۴۸
☆......تمہارے شہر کا سناٹا بھی عجب دیکھا ۳۴۹
☆......مجمع سنگ گرداں ۳۵۰
☆......کس طرح تار دامانِ شب ۳۵۳
☆......اے کشتگان جراتِ اظہار دیکھنا ۳۵۵
☆......فاصلہ ہی کتنا تھا میکدے سے کوئے یار ۳۵۶
☆......شیخ کی نوازش ہے اور ہم تہی داماں ۳۵۷
☆......دلداری دستِ قاتل میں کیا فکر کریں جان وتن کی ۳۵۸
☆......وائے ساحل نے کیا کہا کہ ۳۵۹
☆......ساتھیو دوستو ۳۶۰
☆......ہلکا سفر ہو باد صبح نو بہار کا ۳۶۱
☆......اہل گلشن نے کی اس گل کی پذیرائی بہت ۳۶۲
☆......میرا حق ہے کہ وہ روٹھے تو منالوں اس کو ۳۶۳
☆......دل کی کسی محفل میں پذیرائی نہیں ہے ۳۶۴
☆......تری یاد ہے چراغاں ترا تذکرہ بہاراں ۳۶۵
☆......پھر اب کے آیا نہیں دل کا قافلہ کوئی ۳۶۶
☆......میں دار ورسن کو چومتا ہوں ۳۶۷

☆......تیری طرف نہ گذرنا تھا اور جا نکلا ۳۶۹
☆......دل کی وحشت سے عجب کام لیا ہے ہم نے ۳۷۰
☆......رستے کے دونوں جانب ۳۷۱
☆......فکر بے نوا ٹھہری حرف بے صدا ٹھہرے ۳۷۲
☆......تمام رات جسے جاگ کر لکھا میں نے ۳۷۳
☆......یہ سوچ کر ستم ترے ہم لوگ سہہ سکے ۳۷۴
☆......مدتوں بعد ۳۷۵
☆......نہ چارہ گر ہے نہ ناصح نہ اب رقیب کوئی ۳۷۷
☆......حسن نہ ہو تو کائنات فضول ۳۷۸
☆......آخری موڑ پہ زندگی کے ۳۷۹
☆......عزم منزل ہی تھا راہ منزل نہ تھی ۳۸۰
☆......کیا فکر ہماری کہ سدا غرق لہو میں ۳۸۱
☆......اس ہجوم خاکساراں میں بہت سے لوگ ہیں ۳۸۲
☆......ہے گھومنے کا لطف کہ بیکار گھومئے ۳۸۳
☆......مجھ کو معلوم نہ تھا ۳۸۴
☆......چراغ راہگذر برگ زرد خاک چمن ۳۸۷
☆......اپنے ہونے کے سزا پائی ہے ہم نے ایسی ۳۸۸
☆......کیسے تھی فرصت آوارگی فکر وخیال ۳۸۹
☆......کل کے انسان کے امکان میں ہے ۳۹۰
☆......ایک چنگاری کی ہستی ہی بھلا کیا لیکن ۳۹۱

☆......ہم وفا کرنے پہ ایسے کوئی مجبور نہیں ۳۹۲
☆......لامکاں نام ہے اس زنداں کا ۳۹۳
☆......آذر کو بت عزیز ہے ہم کو خدا عزیز ۳۹۴
☆......ہم کو جس شہر میں سناٹا نظر آتا ہے ۳۹۶
☆......نہ کسی حرف حکایت کی کھنک ہے نہ گلہ ۳۹۷
☆......ہر اضطراب میں جینا سکھا دیا ہم کو ۳۹۸
☆......عمر گر وفا کرتی ہم کو فیض کیا ملتا ۳۹۹
☆......خوابوں میں کھلی ہوئی ہیں آنکھیں ۴۰۰
☆......رنگینیٔ عارض سے ہے رنگینیٔ فضا کی ۴۰۱
☆......غم دوراں غم جاناں غم ذات ۴۰۲
☆......زندگی کا عجیب عالم ہے ۴۰۳
☆......جیسے ہولی کے سب گڈ مڈ جگمگ کرتے رنگ ۴۰۴
☆......غم دوراں کی طرح تھا غم جاناں کا فریب ۴۰۵
☆......پندارِ آبرو میں بہت بد دماغ ہیں ۴۰۶
☆......کوئی ایسا نگر بھی ہوتا ہے ۴۰۷
☆......اس کو رسوائی کہتے ہو یہ کیسی رسوائی ہے ۴۰۸
☆......دل دکھ جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے ۴۰۹
☆......کیسا صحرا کیسی لیلیٰ لوگ انہیں کیا جانے ہیں ۴۱۰
☆......پڑا ہے واسطہ اس بدگماں سے ۴۱۱
☆......حسن نیرنگی جمال کے ہیں ۴۱۳

☆......اچھا چلیے وحشی دل کا کوئی مداوا کرتے ہیں ۴۱۵
☆......ہر طرف جسم جسم چھالے ہیں ۴۱۶
☆......بام و در کی سانسوں میں ریت کے سوا کیا ہے ۴۱۷
☆......پائے رہزن کے لئے زنجیر کیوں بنتی نہیں ۴۱۸
☆......کس درجہ اعتماد ہمیں راہبر پہ ہے ۴۱۹
☆......خٹک ناچ ۴۲۰
☆......کچھ تو اپنی نگاہ ۴۲۱
☆......احترام میکدہ لازم ۴۲۲
☆......پھر وہی چاک گریباں ۴۲۳

ہم خبر دیتے ہوئے نام بنام آئے ہیں
شہر والوں کو بہاروں کے سلام آئے ہیں

عزمِ زنداں ہی سہی، حوصلۂ جاں ہی سہی
جو متاع پاس تھی لیکر ترے نام آئے ہیں

وہ جو بے کار زمانے میں تھے سودائی تھے
وقت آیا ہے تو وہ لوگ ہی کام آئے ہیں

سانس اکھڑتی ہے جو پل بھر کو ٹھہر جاتے ہیں
دوستو راہ میں یہ کیسے مقام آئے ہیں

☆☆

اے دست جنوں کیجئے تقاضا کوئی دن اور
ٹھیری ہے یہاں رسم تماشا کوئی دن اور
اب راس نہیں دشت غزالاں کی ہوائیں
کیجیے کسی وحشی کی تمنا کوئی دن اور

کچھ تجھ کو بھی خبر ہے کہ کیا پوچھتے ہیں لوگ
دار و رسن سے میرا پتہ پوچھتے ہیں لوگ

انصاف کی تلاش میں پھرتے ہیں در بدر
رہتا ہے کس طرف کو خدا پوچھتے ہیں لوگ

تجھ سے ملی ہیں دل کو ہزاروں جراحتیں
تجھ سے جراحتوں کی دوا پوچھتے ہیں لوگ

☆☆

مجھ پر بھی ہے گماں انہیں فرہاد و قیس کا
میری وفا کو لوگ ابھی جانتے نہیں
پھر کس سے ہم حکایت درد و ستم کہیں
واعظ سمجھتا ہی نہیں، تم مانتے نہیں

1975

مزدوروں کی فتح کا سورج ابھر رہا ہے
جو کوئی اسے دیکھ نہ پائے
ایسا شخص تو اندھا ہے
ہم اس کی کیا مدد کریں گے

اس سورج کے جلو میں ہیں
لاکھوں آوازیں
کلیاں چٹکنے کی آوازیں
کھیتوں میں خوشوں کی صبا سے سرگوشی
صحراؤں کے سینے میں ہل کی جھنکار
دھرتی کے بیٹوں کے نغمے
دہقانوں کے گیت کی لے
مزدوروں کے آزادی کے مست ترانے
سرخ پھریرے کے لہرانے کی آوازیں
جو کوئی انہیں سن نہ پائے
ایسا شخص تو بہرا ہے
ہم اس کی کیا مدد کریں گے

اس سورج کے جلو میں ہیں
لاکھوں خوشبوئیں
امن کی خوشبو پیار کی خوشبو
سوندھی مٹی کی خوشبو
دھرتی کی ممتا کی مہک
دل کے ہار سنگھار کی خوشبو
کھیتوں میں پودوں کی خوشبو
چمن چمن پھولوں کی خوشبو
گلیوں سڑکوں بازاروں میں
محنت عظمت پیار کی خوشبو
فیکٹریوں میں محنت کرنے والے ہاتھوں کی خوشبو
کنج چمن میں
پیار کی ماتی آنکھوں کی خوشبو
جو کوئی یہ خوشبوئیں پہچان نہ پائے
ایسا شخص تو پاگل ہے
ہم اس کی کیا مدد کریں گے

○

یہ ہجر و وصلِ صنم نہیں ہے یہ قصۂ بیش و کم نہیں ہے
نہیں اسے سرفرازی حاصل جو سر یہاں پر قلم نہیں ہے

جو تجھ سے وابستہ داستاں تھی وہ میں نے اپنے لہو سے لکھی
مگر حکایت مرے لہو کی رقم نہ ہو تو بھی غم نہیں ہے

فگار تن کو بچانا کیسا یہ داغِ سجدہ چھپانا کیسا
جہاں سے یہ آفتاب لائے وہ شہر کیا محترم نہیں ہے

جو میرا عزم و ارادہ توڑے جو بڑھتے طوفاں کے رخ کو موڑے
تمہاری جھولی میں حاکموں ایسا کوئی سنگِ ستم نہیں ہے

جو دستِ قاتل کی داد دے گا جو مدحِ اہلِ ستم کرے گا
وہ شخص خنجر بکف تو ہوگا وہ شخص اہلِ قلم نہیں ہے

○

کرتے ہیں گراں نرخ غمِ یار دیکھنا
پھر دیکھیں اہل درد کا بازار دیکھنا

وہ جنسِ گراں نہیں سرِ بازار دیکھنا
بک جائے زلیخا سا خریدار دیکھنا

آگے گئے ہیں جان سے بیمار دیکھنا
آساں نہیں ہے عشق کا آزار دیکھنا

اوجِ سحر میں طالع بیدار یار ہیں
جو دیکھنا ہو ہم کو سرِ دار دیکھنا

اک پرتو جمال ہماری نظر میں ہے
ہم کو ہمیشہ آپ میں سرشار دیکھنا

ہم برگ خزاں دیدۂ خزاں لیکے چلے ہیں
ہم جائیں پھر بہار کے آثار دیکھنا

ہم کو نیت پہ اس کی شبہ تو نہ ہو مگر
ٹھیرا کہاں ہے قافلہ سالار دیکھنا

شہروں شہروں پھرتے پھرتے ہم بھی رسوا خوب ہوئے
جتنی اس کی شہرت پھیلی ہم اتنے معتوب ہوئے

ہم کو سحر کا دھوکہ نہ دو شب کو زلف کا نام نہ دو
ہم نے اسے دیکھا ہے جسکے نام سے یہ منسوب ہوئے

اپنا آپ چھپایا ہم نے اور دنیا نے جان لیا
نشہ مے نے گل یہ کھلایا آپ سے ہم محجوب ہوئے

لے کے چلے پیغام محبت کوچہ کوچہ گلی گلی
رسوائی کی فکر بہت تھی رسوا ہوئے اور خوب ہوئے

☆☆

میری آشفتہ سری میں نہیں صحرا کا قصور
یوں ہے کہ میری تمنا مجھے اکساتی ہے
خاک اڑاتا ہے سبھی کہتے ہیں دیوانہ ہے
چشم نم کی بھی کبھی اس کے خبر آتی ہے

۷ جون

سات جون کی تاریخ
حاکموں کی ڈائری میں
ایک سادہ صفحہ ہے
سات جون کی تاریخ
میرے دل کا گھاؤ ہے
جس سے خون رستا ہے
حاکمو تمہارے اور میرے درمیان
یہ دن
اک لہو کا دریا ہے
اک لہو کا دریا ہے

☆☆

نوٹ: 6جون 1972 کو کراچی کے علاقہ سائٹ میں فیروز سلطان ملز کے مزدوروں نے اپنی تنخواہوں کے مطالبے کے لئے احتجاج کیا اور 7جون 1972 کو پولیس نے پرامن مظاہرین پر فائرنگ کردی جس کے نتیجے میں تین مزدور جاں بحق ہو گئے۔

رک جائیں تو ٹھیرے ہوئے طوفاں میں ڈھل گئے
جب چل پڑے تو عہدِ ستم سے نکل گئے

تاریخ کا شعور محبت کی روشنی
نفرت کے دور کو تو اندھیرے نگل گئے

محنت کشوں کے قافلہ سالار ہیں ہم لوگ
ہم آگئے تو راستے سب کے بدل گئے

امسال فصلِ مے میں وہ آتش بھڑک اٹھی
تقدیرِ محتسب کے ستارے بھی جل گئے

میرے لہو نے راہوں میں روشن کئے الاؤ
خطرے سے ہوشیار رہو اور بڑھتے آؤ

تاریک راستوں میں بھٹکتی ہے زندگی
بستی کے رہنے والو کوئی دیپ تو جلاؤ

سناٹا جان لیوا ہے خاموش مت رہو
اپنی صدا نہ دو تو مری گونج ہی سناؤ

چہرے بھی مصلحت کی نقابوں کے ساتھ ہیں
سچائیوں کی آگ کی زد میں نہ ان کو لاؤ

ہم اپنی کوششوں میں تو کم کامیاب تھے
تم اور سر بلند کرو دار پہ چڑھاؤ

☆☆

ملی صلیب تو انسان کا شباب بنے
لہو میں ڈوب کے ابھرے تو آفتاب بنے

○

شاید ہیں قریب منزلوں سے
شعلے سے لپک اُٹھے دلوں سے

ہے رسم ستم عزیز تم کو
مقتل گئے لوگ محفلوں سے

آواز دو پھر نہ پا سکو گے
بچھڑے ہوئے لوگ قافلوں سے

دیوانے کہاں گئے تمہارے
سناٹا سا ہے بہت دنوں سے

جو بات ہم نے آج کہہ دی
سمجھو گے تم پر مشکلوں سے

☆☆

آتی رہی ہے جن دنوں قید وستم کی یاد
جاتے رہے ہیں دیکھنے زنداں کبھی کبھی

○

ہونٹوں کی پیاس دل کی جلن جسم کی تپش
ہم نے تمہارے نام پہ ہر زہر پی لیا

یارو یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہوئی
مرنا بہت محال تھا یوں میں بھی جی لیا

معتوب اس لیے ہیں ہمیں ان پہ فخر ہے
الزام یہ نہیں کہ کوئی زخم سی لیا

مجرم ہے وہ کہ جس نے ترا ذکر بھی سنا
وہ کشتنی ہے جس نے ترا نام بھی لیا

☆☆

تجھ کو پہچان کر ہم تیرے فسوں تک پہنچے
یہ تو معراجِ خرد ہے کہ جنوں تک پہنچے
ہاں سلامت رہے اس شوخ کے رخسار کی چھوٹ
رنگِ مے، دل سے سوا حد فزوں تک پہنچے

اہل دانش زنداں میں ہیں خیر نہیں دیوانوں کی
تم نے تو ہر رسم اٹھا دی شہروں کی ویرانوں کی

آج سے ہم بھی اپنا لہو اور اپنے جذبے بوئیں گے
تم بھی تو اک فصل اٹھاؤ دہکے ہوئے انسانوں کی

ہم ہیں جنھوں نے عہدِ ستم میں صرفِ جاں کا عہد کیا
آؤ ہم سے بات کرو زنجیروں کی زندانوں کی

تین شعر

نہ سہی کوئی یہاں تیرا شناسا نکلے
قافلے ان سے ہی بنتے ہیں جو تنہا نکلے

تنہا اس شہر میں اک ہم ہی نہیں دیوانے
ان کو کیا کہیے گا جو بہر تماشا نکلے

موسمِ گل کی ہنسی ڈھونڈنے نکلے جو کوئی
اپنے سینے میں لئے آگ کا دریا نکلے

عشق کا دعویٰ کرتے ہو اور دل پہ کوئی داغ نہیں
شہر میں جو پتھر نہ کھائے وہ بھی کوئی دیوانہ ہے

نکہت گل کی قید گوارا زلفوں کی زنجیر عزیز
دل طوفاں کے آگے سرکش اور ان کا دیوانہ ہے

بچوں کے ہنسنے کی صدا جاڑوں کی سنہری دھوپ بھری
ہر آنگن میرا آنگن، ہر گھر جانا پہچانا ہے

☆☆

یہ شغلِ جاں کا ہی ہے جنوں آسان نہیں جانو
دلوں کے زخم کھلنے پر گریباں چاک ہوتا ہے
نہادِ غم سے بنتا ہے خمیرِ آدمی ورنہ
جو غم کی تاب نہ لائے خس و خاشاک ہوتا ہے

○

دعوئ فیضِ عام بھی ہے پابندی گردشِ جام بھی ہے
یہ طرزِ سیاست اے ساقی میخانہ پر دشنام بھی ہے

جو مجھ پر گذری سب کہہ دی پر حسنِ بیاں میں بھول گیا
اس افسانہ میں، اہلِ ستم میں، اس کا اپنا نام بھی ہے

ہم تشنگی جس کو کہتے ہیں اک سلسلۂ لذت ہے جہاں
گلشن کی فضا بھی، نشۂ مے بھی، میخانہ بھی جام بھی ہے

عیار بتوں کے ہاتھوں میں کیا حشر بنے گا کیا کہیے
سرنامۂ فردِ سیاست میں ہم سادہ دلوں کا نام بھی ہے

آئینِ ستم سے روگردانی ہی اک تنہا جرم نہیں
تدوین اصول وحشت کا ہم پر تازہ الزام بھی ہے

گو شعر و سخن بھی آتا ہے لیکن ہے اور ہی بات اس میں
ایک مدت گذری جب سے وہ اس کوچہ میں بدنام بھی ہے

○

ہاں اے نفس سوختہ اک طرزِ فغاں اور
اس شوخ کا غم مانگے ہے اندازِ بیاں اور

دل تیری ملامت سے پرے ٹھیرا ہے واعظ
ہیں میری تمنا کے مکیں اور مکاں اور

ہر دور میں ہوتا ہوں طلوع منصبِ نو پر
مقتل ہو کہ زنداں، ہوں ابھی رقصِ کناں اور

کونپل نہ ہو سرسبز اگر ہم نہ لہو دیں
بے فیض جنوں ہوتے ہیں اندازِ جہاں اور

جو کہیے بجا، ہم کو فقط ایک گلہ ہے
اس لہجہ سے وابستہ ہے بات اور زباں اور

آوارگیٔ نکہتِ گل ہے تو صبا ہے
ورنہ تو یہاں نام ہیں کچھ اور نشاں اور

کچھ دور سے تو آئے نظر روشنی یاروں
ہونے دو فروزاں تم ابھی مشعلِ جاں اور

○

ستا رہی ہے ستمگر کو آرزو میری
سنا رہا ہے بہانوں سے گفتگو میری

بلاکشانِ محبت میں نیک نام ہوں میں
ترے ستم سے شہر میں ہے آبرو میری

لہو دیا ہے گلستاں کے حسن کی خاطر
روش بھی میری، مرے گل ہیں آبِ جو میری

تری تلاش میں نکلے تو جاں گذر گاہ تھی
عجب سفر پہ لے آئی ہے جستجو میری

☆☆

سو رنگ ہیں چمن کے تو دل کے ہزار رنگ
صرف ایک کائنات ہے اور بے شمار رنگ
اس سے ملے ہوئے تو بہت دن گذر گئے
ہجر فسردہ جاں میں ہیں جانِ بہار رنگ

○

کچھ نئی بات نہیں تم نے کہی ہے یارو
ہم بھی رسوائیِ اربابِ وفا جانتے ہیں

اپنی فہرست میں کس کس کا لکھو گے تم نام
یاں تو جتنے بھی ہیں مرنے کی ادا جانتے ہیں

ہم یہی سوچ کے اس دشت میں آ نکلے ہیں
منزلوں کا تو پتہ راہ نما جانتے ہیں

تین شعر

ہجوم تلخیِ کام و دہن ہے
زہر ہے ہاتھ میں سر پر کفن ہے

کمان قوسِ قزح کی اٹھ رہی ہے
ترے انداز میں وہ بانکپن ہے

خزاں سے کیا گلہ اپنوں نے لوٹا
کہ شرمندہ ہو صحرا وہ چمن ہے

جلنے لگے ہیں پاؤں بگولوں کا رقص ہو
رکنے لگا ہے حبس سے دم آندھیاں اٹھاؤ

منزل کے راستوں کو چھپائے ہوئے ہے ریت
ان وادیوں میں آؤ تو آندھی بھی ساتھ لاؤ

اب تک لہو میں اپنے نہاتے رہے ہو تم
وقت آ گیا ہے دشمنوں کے خون میں نہاؤ

بن جائے جب وجود ہی شعلہ تو فکر کیا
کیا سوچتے ہو آگ کے دریا میں کود جاؤ

راہوں میں خار و خس کے یہ بیکار ڈھیر ہیں
جنگل سلگ اٹھے گا ذرا آگ تو جلاؤ

لوٹے ہیں جیت کر کے بہت لوگ بازیاں
میدان کار زار کو تم بھی تو آزماؤ

پرچم کا انتساب شہیدوں کے نام ہے
پرچم کو آنسوؤں کے ستاروں سے نہ سجاؤ

کھلا ہوا تھا در میکدہ پہ ہم نہ گئے
ہماری تشنہ لبی یادگار ہے یارو

اسی سے حوصلہ جاں یہی بلائے جاں
عجیب شے یہ غمِ روزگار ہے یارو

کوئی مسیحا نفس ہو تو کوئی بات بنے
وہ میرے قتل پہ اب شرمسار ہے یارو

ہو خیر اہلِ جنوں کی، خود اب کے فصلِ گل
گریباں چاک ہے داماں تار ہے یارو

☆☆

راہ میں سلسلہ دار و رسن باقی ہے
دل وحشی کہیں تیرا بھی چلن باقی ہے
لہو کرتی ہے طلب فصل نئی کانٹوں کی
رہرواں، آبلہ پائی کا بھی فن باقی ہے

○

دل تو کبھی بھی خوگرِ دستِ جفا نہ تھا
ہم کو ترے ستم کا گلہ کچھ نیا نہ تھا

اہلِ شہر کی جان پہ بے وجہ بن گئی
ورنہ ستم تو آپ کا سب دوستانہ تھا

اب تو عبث ہے زلفِ پریشاں کی داستاں
اُس وقت بات کہنے کا یہ اک بہانہ تھا

ہم کیا کہیں کہ لوگوں کی حالت گواہ ہے
جب تم تھے اس دیار میں کوئی خدا نہ تھا

تم آگئے تو بزم میں سناٹا چھا گیا
یا سب کو تھا گلہ یا کسی کو گلہ نہ تھا

ہم عمر بھر چلا کئے دیوارِ شب کے ساتھ
باہر نکل نہ پائے کوئی راستہ نہ تھا

○

ہوا زمانہ کہ گذرے تھے سربلند کئے
وہ لوگ نام پہ جلتے ہیں آج جن کے دئے

ستم گران شبِ ظلم چپ رہو کہ میں
فصیلِ دار سے آواز دوں سحر کے لئے

بہت سے لوگوں کو مجھ سے شکایتیں ہیں بہت
یہ اور بات کہ میں نے کسی کو دکھ نہ دئے

بنام مہر و محبت ستم گری نہ کرے
کوئی تو ہو جو ہمارے بھی دل کے چاک سیئے

☆☆

وہ سنگِ ملامت کا ہنر دیکھ رہے تھے
ہم شوخیِ اندازِ شرر دیکھ رہے تھے
محضر میں مرے جرم کی تفصیل لکھی تھی
حاکم اسے ایک ایک سطر دیکھ رہے تھے

میرا لہو

میرا لہو
سیلاب کی مانند پھیلنا چاہتا ہے
میرا لہو
شعلہ کی مانند جلنا چاہتا ہے
میرا لہو
طوفان کی مانند
بوسیدہ بنیادوں کو ڈھا دینا چاہتا ہے
میرا لہو
دھرتی کی حکایت
میرا لہو
انساں کا فسانہ
حق اور ناحق کا پیمانہ

میرے لہو میں
ارضِ شکاگو کے مزدوروں کا بھی لہو ہے
میرے ملک کے طالب علموں کا بھی لہو ہے
جلیانوالہ باغ کے پیاروں کا بھی لہو ہے
میرے لہو میں ناصر بھی ہے
فیوچک بھی ہے
اس ساری دھرتی پر جو بھی ظالم سے ٹکرایا ہے

اس کا لہو بھی
میرے لہو میں شامل ہے
میرا لہو
ارزاں بھی ہے اور فراواں بھی
جیسے پانی سمندر کا
جو دھرتی کے کونے کونے
ساحل ساحل جاتا ہے
پیار کے بول سناتا ہے
دیکھے اور ان دیکھے رشتے
سارے جگ میں بناتا ہے
میرا لہو خوشبوئیں لیکر
ہر سرحد تک جاتا ہے

میرا لہو
اک وسیع سمندر
جس کی نرم سطح کے نیچے
غیض و غضب کے طوفان ہیں
ایسا سمندر
جس کی گہرائی بھی اتھاہ ہے
وسعت بھی بے پایاں ہے
جس کی تہہ میں دھرتی کی تاریخ کے ملبہ
دبے پڑے ہیں
جنہوں نے میرے غیظ و غضب کو دعوت دی تھی

○

یقین ہے تو صفوں میں قدم ملا کے چلے
جسے یقین نہیں ہم کو آزما کے چلے

ہمارے قافلے تو اس طرح سے بنتے ہیں
تماشا دیکھنے والے علم اٹھا کے چلے

ہمیں قبول نہیں ہے ملامتِ یاراں
تمہارے نام پہ کیوں کوئی سر جھکا کے چلے

سکوتِ شب کے غزلخوانوں کو سلامِ سحر
سحر سے پہلے جو لاکھوں دیئے جلا کے چلے

تمہیں نہ ہو تو نہ ہو اعتبارِ صبحِ نو
ہمیں تو ہے ہم اندھیرے کے تیر کھا کے چلے

☆☆

کون پہنے ہوئے گزرا ہے لباسِ زنجیر
کس کی جھنکار ہواؤں کو سنائے یہ شہر

○

ہجوم عاشقاں میں گم بھی ہوں سب سے نمایاں بھی
شریکِ اہل زنداں بھی سرِ نام شہیداں بھی

ستارے ٹوٹنے سے ہوگئے رُسوا وگرنہ ہم
تمہارے نام پہ اشکوں سے کب کرتے چراغاں بھی

ستم یہ ہے مرے قاتل مجھے الزام دیتے ہیں
کہ اپنے قتل کے میں نے بہم پہنچائے ساماں بھی

تمہارا تذکرہ یادوں کے سائے دل کی امیدیں
متاعِ درد منداں ہے جمالِ شام ہجراں بھی

ابھی کیا دیکھنا ہے جذبۂ تزئینِ گلشن کو
ابھی تو آدمی گھائل بھی ہے زخموں سے رقصاں بھی

☆☆

ہم رندوں کے روز و شب ہنگاموں میں کٹتے ہیں
یا قلقلِ مینا ہے یا شورِ سلاسل ہے

○

جلنا مرا نصیب ترے عہد میں سہی
جلتے ہوئے چراغ کا حاصل ہے روشنی

دار و صلیب قامت عہدِ بہار میں
ہے خوش نصیب جسکو یہ خوش قامتی ملی

دریا سراب ہوگیا صحرا کی ریت میں
فکر معاش میں یوں تری یاد کھو گئی

ایسا بھی اک لمحہ مری زندگی میں تھا
سنسان راستوں پہ جلا ہو دیا کبھی

☆☆

دوستی بن گئی ہے پردۂ آزاری جاں
لوگ کس کس پہ کریں دشمنیٔ جاں کا گماں
کتنی تاریک ہے زنداں کی فضا ہم نفسو
کتنا نزدیک ہے اب صبح منور کا نشاں

○

ایک لڑکا کہ جس کے چہرے پر
ایسی معصومیت کہ جیسے خدا
مجھ سے کہنے لگا کہ ساتھ چلیں
اک لڑکی کا سستا ہے سودا
میں نے پوچھا وہ کون ہے تم کون ہو
اس نے مجھ سے کہا یا خود سے کہا
آپ کی بیٹی ۔ آپ کا بیٹا

☆☆

ایک بچے نے مجھ سے مانگ کے بھیک
مری نس نس میں بھر دیا ہے زہر
راج میں جسکے بچے بھوکے مریں
اس حکومت پہ ہو عوام کا قہر

دیتے ہیں سزا یوں کہ نہ جرم ہے نہ خطا ہے
کیا دشمنِ جاں کوچۂ جاناں کی فضا ہے

انسانوں کی کمیابی کا تو ذکر ہی کیا ہے
ہے حد ادب، سامنے ہر شخص خدا ہے

کیا لوگ ہیں سب لوگ یہاں اہلِ غرض ہیں
اس پر بھی غرض مندی بڑا جرم ہوا ہے

وحشت ہے نہ احساس طلب صحرا نوردی
اک شغل ہے رسوائی کا جو ہم کو ملا ہے

ملتا ہی نہیں کوئی خریدار وفا کا
یہ جنس نئی ہے یا یہ بازار نیا ہے

روشن غم فردا سے تخیل کا فسوں ہے
وہ غم جو ترے نام رقم ہم نے کیا ہے

سر بزم شہیداں رقصِ بسمل آج بھی ہوگا
تماشا بہر طبع دستِ قاتل آج بھی ہوگا

ملا ہے منصفوں سے اذن قتل عام حاکم کو
گناہ خلق کا کفارہ حاصل آج بھی ہوگا

تمہارے زخم ہمارے دست و بازو کی گواہی ہیں
تمہارا بچ نکلنا اور مشکل آج بھی ہوگا

سنا ہے وہ ستم گر جو تغافل آشنا بھی ہے
ہجوم عاشقاں کی سمت مائل آج بھی ہوگا

جنوں تکمیل پاتا ہی رہا ہے قتل گاہوں میں
نصاب زیست میں یہ درس شامل آج بھی ہوگا

نظر سے موڑ پہ اوجھل اگر ہو کارواں تو کیا
کہ مصروف تلاشِ راہ منزل آج بھی ہوگا

فریبِ رہبری کھاتی رہی ہے خلق برسوں سے
لباسِ رہبری میں اپنا قاتل آج بھی ہوگا

○

جون بہتّر کی تاریخ نے
دو ہی باتیں ثابت کی ہیں
یہ کہ ہم کتنے جیالے ہیں
یہ کہ تم کتنے بزدل ہو
ہم سینہ پر گولیاں کھا کے
آگے بڑھتے جاتے ہیں
تم بندوقیں تھامے پھر بھی لرز رہے ہو
گولی چلاتے جاتے ہو اور پیچھے ہٹتے جاتے ہو
ہم کہ موت سے لڑ جاتے ہیں
تم کہ جنازوں سے ڈرتے ہو

نوٹ: 7 جون 1972 کو کراچی کے علاقہ سائٹ میں فیروز سلطان ملز کے پرامن مزدوروں پر پولیس نے فائرنگ کی جس کے نتیجے میں تین مزدور جاں بحق ہو گئے۔

۱۳ نومبر......حسن ناصر

میرا اتر کہ میرا ورثہ
محنت کش طبقہ سے میرا عہدِ وفا
عہدِ وفا
جس کی بنیادیں
سچائی تاریخ شعور اور انسان کی مظلومی پر ہیں
میری جرأت جس سے میرے قاتل حیراں
میری دلیری جس سے ظلم کے ایواں لرزاں
میرا عزم اور میرا جنوں
جس کو دھوکہ دے نہ سکا ظلمت کا فسوں
جس کا رستہ روک نہ پائے
ظلم و تشدد کے طوفاں

میرا ورثہ
میری صدا
جو لاہور کے محبس سے
قلعۂ شب کا سینہ چیر کے باہر آئی
اور ضمیرِ انسان میں سیسے کی طرح سے اتر گئی

میرا ورثہ
لذتِ سنگ و آبلہ پائی
زنداں کی یخ بستہ سلاخیں

میری قوت میرا حوصلہ
جس کی گواہی برف کی سل ہاتھوں میں اترنے والی میخیں دینگی
جس کی گواہی زنداں دیگا
جس کی گواہی قاتل دینگے

میرا ورثہ
سرخ علم
دنیا بھر کے مزدوروں کا سرخ علم
جس سے محنت کش طبقہ کی صدی صدی کی جدوجہد وابستہ ہے
جس سے دنیا کے مظلوموں کی امیدیں بندھی ہوئی ہیں

میرا وارث وہ ہے جو
میرا عہد وفا نبھائے
میری جرات میرا حوصلہ لے کے آئے
جس کے نام سے زنداں کانپیں
جس نے جرم حق گوئی پر کبھی نہ معافی مانگی ہو
جس نے بارشِ سنگ کو اپنے جنوں کی قیمت سمجھا ہو
جس نے اپنی جاں کو قرض عہد وفا ہی جانا ہو
ایسے لوگ اور ایسے ساتھی
جنھوں نے طوفانوں میں بڑھ کر سرخ علم اٹھایا ہے
وہ ہی میرے وارث ہیں

4-11-75

○

نہ بجھا سکے اندھیرے مری سوچ کے ستارے
کہ سحر سے مل گئے ہیں مری زندگی کے دھارے

سرِ رہگذر لہو نے مرے نقش کیں صدائیں
کوئی ہے جسے زمانہ مرے نام سے پکارے

یہی شرطِ عاشقی ہے ہو عزیز تر وہ بازی
جسے ہار کر بھی جیتے جسے جیت کر بھی ہارے

سرِ رہگذر طلب کا کسے اعتبار ہوگا
یہاں معتبر وہی ہے جو طلب میں جاں گزارے

میرا پیار ان کو پہنچے کہ طلب میں صبحِ نو کی
رگِ جاں میں جن کی نشترِ شبِ ظلم نے اتارے

☆☆

وہ پہلا سچ کہا جس نے میں اس کا وارث ہوں
نشے ہیں زہر کے جتنے وہ میرے جام میں ہیں

○

طوق و زنجیر پہن کر بھی صدا دیتے ہیں
ہم وہ ہیں حوصلے دنیا کے بڑھا دیتے ہیں

تنہا اور بکھرے ہوئے وادئ شب میں یارو
ہم کو آواز دو ہم تم کو صدا دیتے ہیں

دوستو چپ نہ رہو، ایسا نہیں ہوتا کہ لوگ
ڈر سے آندھی کے چراغوں کو بجھا دیتے ہیں

اک کڑی ٹوٹے گی زنجیر بکھر جائے گی
اس لمحہ جان کی بازی بھی لگا دیتے ہیں

زندگی اپنی مٹا دو گے مٹانے میں انہیں
در زنداں پہ جو ہم نقش بنا دیتے ہیں

☆☆

○

جلتے رہے چراغ تو احساس کسے تھا
جب بجھ گئے تو بزم میں سناٹا چھا گیا

کیوں ٹوٹ گئی کیفیتِ انتظار یار
کیا ہوگیا کہ وحشی کو آرام آ گیا

حیراں ہوں کیا تھا جذبہ بے اختیار جو
آوارگئ کوچۂ جاناں سکھا گیا

☆☆

وہ دوانہ نظر نہیں آتا
دوستو آؤ کہ زنداں دیکھیں
جانے کیا روپ ہوگا اس کے بغیر
تجھ کو تنہا شبِ ہجراں دیکھیں

○

جہاں جہاں سے کوئی شاخ گل قلم ہوگی
مرے لہو کی حکایت وہیں رقم ہوگی

نجات دیدہ و دل اس گھڑی کو کہیے جب
فلک کے نیچے کوئی بھی پلک نہ نم ہوگی

مرے شعور سے پھوٹیں گی شش جہت کرنیں
بلاکشیٔ محبت بھی محترم ہوگی

بجھے جو شعلہ جان جاگتا رہے گا لہو
میرے چراغ کی یہ لو کبھی نہ کم ہوگی

☆☆

طلسمِ شب کی فریب کاری دیئے جلاؤ تو ختم ہوگی
یہ رہزنوں کی اجارہ داری لہو بہاؤ تو ختم ہوگی
پیمبرانِ جمال ہو تم جمال رنگ سحر نکھارو
نفس نفس انتظار میں ہے صحیفۂ حسنِ نو اُتارو

1976

○

سیاہی سمٹی چلی آرہی ہے زنداں کی
کہیں قریب ہے یلغار صبح تاباں کی

گھروں کے دیپ جلیں گے تو روشنی ہوگی
اندھیرے شہر میں کیا حیثیت شبستاں کی

زمانہ کہتا ہے پرچم جسے بغاوت کا
وہ دھجیاں ہیں مرے چاک جیب و داماں کی

ہمارے نعرۂ یاہو سے جاگتا ہے شہر
جو ہم نہ ہوں تو ہے ویرانی دیدنی یاں کی

☆☆

مرتے مرتے مری آنکھوں کی چمکتی ہوئی لو
ظلم کی رات میں سورج کا نشاں ٹھیر گئی
مری زنجیر کی جھنکار کی پہلی آواز
رسم پابندی آدابِ بتاں ٹھیر گئی

یہ منصفوں کا مرے فیصلہ ہے کیا کہیے
گناہ جرم نہیں، جرم بے گناہی ہے

تمہیں شہر میں کوئی ہم زباں ملے نہ ملے
ہمارے جرم پہ قاتل کی تو گواہی ہے

یہ صبح شام کے پھیرے بتاتے ہیں ناصح
بتوں سے کچھ تو تمہاری بھی آشنائی ہے

عجب مکاں ہے مجھے آسماں نہیں ملتا
عجب شہر ہیں درندوں کی یاں خدائی ہے

☆☆

پروانہ آزادیِ پرواز ہٹالو
شرمندہ نہیں ہونا ہے یاران قفس سے
ہر قطرہ محبت کی گواہی میں رواں ہے
اورتم یہ سمجھتے ہو کہ خوں ٹپکے ہے نس سے

حق ایسے ملے ہیں ترے آئینِ کرم سے
مانوس ہوئے جاتے ہیں اب لوگ ستم سے

جب اور کوئی تجھ سا ستمگر نہ ہوا تھا
پھر کیا ہے عجب سوختہ جاں ہونگے نہ ہم سے

بیزار ہیں مشکل سے نباہ پاتے ہیں لیکن
باغی نہیں ہوپائے ابھی رسمِ ستم سے

بے نقش لہو جادۂ منزل نہیں ہوتا
دھوکے یہاں کھائے ہیں بہت نقشِ قدم سے

☆☆

اعلان عشق کیجیے رُسوائی پایئے
گلشن کی آبرو کے لیے داغ اٹھایئے
تہمت کوئی نہ کوئی اٹھانا ضرور ہے
بہتر یہ ھیکہ عشق کی تہمت اٹھایئے

سچ یہ ہے کہ غم درپئے آزار نہیں ہے
غم یہ ہے کہ اپنا کوئی غمخوار نہیں ہے

جس کے لیے شوریدہ سری اختیار کی
وہ بھی دلِ وحشی کا طلب گار نہیں ہے

مرتے ہیں کہ اوروں کے لئے جینا ہو آسان
ورنہ ہمیں شوقِ رسن و دار نہیں ہے

اس سادہ و پرکار کی الفت ہمیں معلوم
آسان بھی نہیں ہے جو دشوار نہیں ہے

☆☆

ساقی تری خست کی شکایت کریں کس سے
واعظ بھی ترا حاکمِ بے مہر بھی تیرا
حیراں ہوں کیوں سنگ زنی ہوتی ہے ان پر
دیوانے بھی تیرے ہیں یہ اور شہر بھی تیرا

نیزے شعاع مہر کے دل میں انی ہوئے
شب کٹ گئی تو ہم ہدفِ روشنی ہوئے

کس موڑ پہ لے آئی مری گفتگو مجھے
ناگفتنی جو حرف تھے سب گفتنی ہوئے

جب آ گئے ہیں یاں تو پھر اب فکر کیا کریں
جائیں تو جائیں ہم دل و جاں سے غنی ہوئے

بکھرے تو حلقے روشنی کے اور بڑھ گئے
ہم یوں ہیں جیسے ٹوٹ کے ہیرے کنی ہوئے

کچھ آپ ہی بتایئے ہم کو خبر نہیں
وہ کیا قصور تھے جو وجہِ دشمنی ہوئے

☆☆

جان ترے نام نیلام کرتے چلے
ہم جو رسمِ جنوں عام کرتے چلے

○

دل پہ تنہائیاں ایسی کہ مٹا بھی نہ سکوں
تجھ کو چاہوں جو بلانا تو بلا بھی نہ سکوں

تپشِ شوق میں یہ رسمِ ستم بھی ہے قبول
آگ دامن کو لگے اور بجھا بھی نہ سکوں

بجھ گئے آج سرِشام امیدوں کے چراغ
اب تم آئے ہو کہ میں جشن منا بھی نہ سکوں

ایسا مفلس بھی نہیں ہوں اے نگارِشبِ غم
میں تری مانگ لہو دے کے سجا بھی نہ سکوں

☆☆

شہروں میں روایت نہ رہی پرسشِ غم کی
یہ تازہ عنایت ہے ترے طرزِ ستم کی
غارت ہوئی وہ وصل کی شب فکرِ جہاں میں
بسیار خرابی سے جو شب ہم نے بہم کی

○

وہ شخص گر حاکم کا طرفدار نہ ہوتا
یوں رسوا میں تنہا سرِ بازار نہ ہوتا

جب خانہ خرابی تھی مقدر تو بھلا کیوں
دل تیری عنایت کا طلب گار نہ ہوتا

کچھ اہلِ تمنا سے ہمیں داد تو ملتی
یہ ولولۂ شوق تو بیکار نہ ہوتا

دل میں اگر اس شوخ کے نیکی نہیں آتی
یوں ہوتا ہمیں عشق کا آزار نہ ہوتا

نافذ جو نہ ہوتے یہاں جنگل کے قوانین
رہنا مرا اس شہر میں دشوار نہ ہوتا

سوجاتے کہیں چین سے جا کے اگر ہم کو
شوق تپشِ مشعلِ رخسار نہ ہوتا

بستی میں خرد مندوں کی دیوانے کا کیا کام
زنجیروں میں ہوتا جو سرِ دار نہ ہوتا

○

در پردہ لوگ در پئے آزار ہوگئے
کچھ سوچ کر رقیب بھی غمخوار ہوگئے

جو فنِ شعر گوئی کے پروردگار تھے
لوگو! تمہارے شہر میں لاچار ہوگئے

تھک تھک کے بیٹھے سوئے منزل چلے گئے
جب مر گئے غبارِ رہ یار ہوگئے

☆☆

آنکھوں کا نور دل کا لہو دے کے صبح شام
اعلان کررہے ہیں کہ ہم کیمیا گر ہیں
اب کرتے ہو بے رونقیٔ شہر کا شکوہ
جن لوگوں سے رونق تھی وہی شہر بدر ہیں

○

نکلی ہو بجھانے جنہیں اے تیز ہواؤں
بجھ جائیں گے وہ دیپ، مگر جلتے رہینگے

اے تیرگیٔ شب تجھے شاید نہیں معلوم
یہ ضد ہے ہمیں تا بہ سحر جلتے رہینگے

لب عشق کے ہوجائیں اگر سرد تو ہوجائیں
اس شوخ کے رُخسار مگر جلتے رہینگے

جلتے ہوئے احساس دھواں تو نہیں دیتے
ہم لوگ بہ اندازِ دگر جلتے رہینگے

کیا سوچ کے دیتے ہو ہوا شہر کے لوگوں
یہ آگ تو بجھ جائے گی گھر جلتے رہینگے

☆☆

در قفس کا نہ وا ہو جن کے لیے
وہ پرندے مرے چمن کے نہیں

○

کوئی منصور سرِدار یہاں آیا تھا
اس خرابے سے انا الحق کی صدا آتی ہے

اڑ چکی خاک شہیداں بھی ترے کوچے سے
جانے کیوں پھر بھی یہاں بوئے وفا آتی ہے

تجھ سے وابستہ تمناؤں کا کرتا ہوں شمار
ریت اڑاتی ہوئی صحرا سے ہوا آتی ہے

میری رسوائی بہت دکھ مجھے دیتی ہے مگر
یہ ترے حسن کا پندار بنا آتی ہے

☆☆

عہدِ بہاراں کی تاراجی پر بھی اگر ہم چپ رہتے
دستِ جنوں کو کیا سمجھاتے وحشتِ دل کو کیا کہتے
اس کے شہر میں جس سے چاہو پوچھ لو ہم دیوانوں کو
آخر ساری عمر کٹی ہے پتھر کھاتے دکھ سہتے

تین شعر

انسانیت کی منزل آخر حسین ہے
میری متاعِ زیست یہی اک یقین ہے

طوفانِ مصلحت کو میں پہچانتا نہیں
سچائیوں کے پاؤں کے نیچے زمین ہے

تحریر آبِ زر سے ہے پیشانیوں پہ جھوٹ
کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ چہرہ حسین ہے

تین شعر

جب مرے چہرے کی جلتی لو کو گہنایا گیا
شہر کے رستوں میں کتنی دور تک سایہ گیا

بستیوں تک پھیل جاتی آگ تو پھر دیکھتے
کون جانے کس طرح جنگل کو بہلایا گیا

ناصحو اس کے لیے جان کا زیاں کیا لطف ہے
تم بھی چل نکلو تمہیں بھی کتنا سمجھایا گیا

سوویت یونین کا نیا آئین

یہ دستور صبح طرب آئین نشاط شام ہے
انسان کی خلاقی کی مہر، انساں کی آزادی کی لے

اعلان عظمت محنت ہے، اعلانِ قطع غلامی ہے
تاریخ کے دولہا کی یہ عروسِ عہدِ نو کو سلامی ہے

اک اک حرف میں اسکے مظلوموں کے چہرے روشن ہیں
اک ایک لفظ کے نیچے پھیلے جانے کتنے دامن ہیں

نازاں ہے تخلیق پہ محنت جذبوں کی معراج ہے فن
جسم آزاد اور پیار امر زندہ لذت کام و دہن

آزادی تخلیق کا محور، جبر کی محنت اور نہیں
انسان ہو انسان کا آقا ایسا اب کوئی طور نہیں

سورج بن کے ابھرا ہے زنداں کے دکھ جس نے سہے ہیں
دھرتی نیچے سمٹ رہی ہے اس کے شہر پھیل رہے ہیں

پاکستان بھی دور نہیں ہے چلّی بھی ہمسایہ ہے
ظلم کی تپتی دھوپ جہاں ہے وہیں پہ اس کا سایہ ہے

یہ اعلان ہے دھرتی پر انسانوں کے احسانوں کا
سوشلزم کا پرچم اونچا رکھنے والے شانوں کا

یہ دستور اعلانِ جرس ہے، دنیا کے مجبورو آؤ
شاگردو، دیہات کے لوگوں محنت کش مزدورو آؤ

لوگ جہاں بے جرم وخطا دس دس کوڑے کھاتے ہیں
کچھ فریادیں کرتے ہیں، کچھ یونہی چپ مرجاتے ہیں

جہاں جہاں انصاف کی خاطر خون کی ہولی ہوتی ہے
ایک روٹی کے دام جہاں عزت کی بولی ہوتی ہے

کھلیانوں کے بھرنے والے جہاں پہ بھوکے مرتے ہیں
ریشم اور دیبا بننے والے کھدر کو بھی ترستے ہیں

جہاں پہ فیسیں مہنگی ہیں شاگردوں کی جانیں سستی ہیں
دن کے اجالے میں بھی جہاں کالی راتیں بستی ہیں

نئی روایت ڈالو جو اعلان عظمت محنت ہو
مظلوموں کی مجبوروں کی آزادی کی ضمانت ہو

نوٹ: 1977 کے آئین نے 1924 اور 1936 کے آئین کے مقابلے میں معاشرے کے آئینی ضابطے کے دائرہ کار کو بڑھا دیا۔

30-9-77

کربلا کربلا
دشتِ تیر و سناں
آبِ تیغ رواں
ریگزارِ وفا
کربلا کربلا
جرأتیں بے گماں
عظمتیں لامکاں
طفل بھی ہیں جواں
یہ ترا قافلہ
کربلا کربلا
کل بھی تھی آج بھی
ظلم کی تیرگی
روشنی روشنی
کربلا کربلا
شام و کوفہ مرا
جلتا صحرا ترا
یہ مرا عہد ہے

وہ ترا عہد تھا
کربلا کربلا
خیمے جلتے ہوئے
خوں اگلتے ہوئے
پیاس کے زندان میں
لوگ پلتے ہوئے
کل بھی تھے آج بھی
تیرگی تیرگی
روشنی روشنی
کربلا کربلا

19-12-77

○

ہماری سعی مسلسل کا یہ صلہ ہوگا
کہ ہم نہ ہوں مگر عہد ستم بھی نہ ہوگا

ہے کہکشاں کی طرح نقش میری یادوں میں
وہ راستہ جو کبھی تیرا راستہ ہوگا

کبھی تو صحن میں اترے گی زندگی کی برات
کبھی تو عشق میرے دور کا خدا ہوگا

تمہارے شہر میں گذری ہے زندگی لیکن
سوا تمہارے ہر ایک میرا شناسا ہوگا

رقیب میری طرح آپ کے ستم کا شکار
اسے برا نہ کہیں آپ تو بھلا ہوگا

طور کے مجھ کو سناتے ہو فسانے موسیٰ
تم نے شاید مرے محبوب کو دیکھا ہوگا

یہ تری مشقِ ستم ہم پہ اے غفور و رحیم
جو بندہ پوچھے تو تیرا جواب کیا ہوگا

○

جاگی ہوئی شب کی پلکوں پر
ٹھیری ہوئی یادوں کے موتی
یوں مجھ سے گریزاں ہیں جیسے
رشتہ ہی نہیں ان سے کوئی

رخصت کی گھڑی ملنے کی ادا
ہر لمحہ ان میں ملتا ہے
یادوں کے تنہا آنگن میں
سناٹا رنگ بدلتا ہے

کیا دھوپ کڑی اور کیا سایہ
ہر رُت نے تجھ کو روپ دیا
ہر آتے پل نے آشا دی
ہر جاتے پل نے نراش کیا

زلفوں کی گھنیری چھاؤں میں
ہم نے کب کب آرام کیا
کیسے ان نٹ کھٹ نینوں کو
شرمانا سکھایا رام کیا

رات ہے کہ ڈھلتی جاتی ہے
دل ہے کہ مچلا جاتا ہے
آنکھوں کے دریچۂ روشن میں
اور دیپک بجھتا جاتا ہے

یوں آس کی لڑیاں ٹوٹی ہیں
پروانہ پہنچ سے دور ہوا
خود اپنے جلائے دیپک سے
جب آگ لگی مجبور ہوا

پتوں پہ کسی کی چاپ نہیں
خوشبو کا کوئی پیغام نہیں
ان ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں
آہٹ کا تیری نام نہیں

پگڈنڈی پر سناٹا ہے
اور دور تلک سایہ بھی نہیں
ہم یونہی وہاں سے اٹھ آئے
اور دل کو بہلایا بھی نہیں

23-12-77

○

احساس عظمتِ انساں ہو جب عام تو کوئی بات بنے
آئے نہ جبیں پر سجدوں کا الزام تو کوئی بات بنے

یہ بارشِ سنگ کی رات کٹے سینہ سے ستم کا بوجھ ہٹے
جب پائیں جاگنے والے کچھ آرام تو کوئی بات بنے

جب سارے چہرے روشن ہوں پھر کیا خورشید طلوع ہوگا
چہروں سے دھلے جو گردِ غم ایام تو کوئی بات بنے

سنتے ہیں بہت سے شہروں میں آزاد ہیں دل خوشبو کی طرح
ہوں اہلِ ہوس اس شہر میں بھی ناکام تو کوئی بات بنے

ہم سے دو چار کا ذکر ہی کیا جو دیوانے کہلاتے ہیں
ساری بستی کے لوگ ہوں یاں بدنام تو کوئی بات بنے

☆☆

مر جاتے ہیں پر موت کو ضائع نہیں کرتے
یہ آن رہے ہم تو سرِ دار چلے ہیں

کاغذ کے ایک ٹکڑے پر
تم نے میری سزا لکھی ہے
سات سال اور دس کوڑے
سنو
میں اس بے ہودہ سزا کو
پوری جرات اور بے باکی سے کاٹوں گا
تا کہ میرے موقف کی سچائی
سب پر ثابت ہو
اور
لوگوں میں ظلم سے نفرت اور بے خوفی پیدا ہو

کام مشکل تھا، غمِ عشق سے آساں نکلا
قطرۂ خونِ جگر، نوح کا طوفاں نکلا

دلِ وحشی کو بہلنے نہیں دیتی تری یاد
دشتِ نیرنگ جہاں بھی مرا زنداں نکلا

عارض و لب سے چلی بات تو آگے نہ بڑھی
وہ سراپا تو میرا دیدۂ حیراں نکلا

ترکِ الفت کا تقاضہ بھی اسی شخص کا تھا
جانے کیوں مجھ سے بھی زیادہ وہ پریشاں نکلا

خوش ہوئے دیکھ کے راہوں میں صلیبوں کے نشاں
ہم نے جانا کہ رہِ شوق کا ساماں نکلا

آج پھر دل تیری یادوں سے منور ہوگا
آج پھر چاند سرِ روزنِ زنداں نکلا

○

جھوٹ کے شہر میں
ظلمتوں کے امین
تازیانے لئے
ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کہ کوئی زباں
حرف حق نہ کہے
دیدۂ خلق میں، روشنی نہ رہے
کوئی سلگا ہوا ذہن قلبِ تپاں
نعرہ زن نہ رہے
ڈھونڈتے پھر رہے ہیں وہ قبریں جہاں
بام ودر سے کوئی روشنی نہ پڑے
چاند چمکے نہ خورشید ہوضوفشاں
اتنی اونچی فصیل شب ظلم ہو
شہر میں دو پہر بھی اندھیری رہے
لوگ کوڑوں کی زد میں بلکتے ہوئے
سوئے زنداں رواں
خلقتِ شہر ہے دادخواہِ پناہ
یہ ہے میرا وطن
میری آنکھوں کا مظلوم تاراوطن

30-9-78

○

ظرف اہلِ وفا نبھا دیں ہم — زخم کھا کر بھی مسکرادیں ہم
یوں لگائیں گلے سے دارورسن — رسم دار و رسن اٹھا دیں ہم
چاک کرتے ہیں جیب وداماں کو — ہم کو منظور زادِ راہ نہیں
لوٹ جائیں گے جانبِ طوفاں — ٹھیرو یہ کشتیاں جلا دیں ہم
جان کہ نذر نگاہِ ناز ہوئی — تیرے رشتے سے سرفراز ہوئی
دستِ رسوائی شکریہ تیرا — تہمت عشق کیا صلہ دیں ہم
حاصل حد خرد ہمارا جنوں — عالم عالم ہے اس کا رنگ فسوں
تیرا سب شہر، گونج اٹھے گا — دشت سے بھی اگر صدا دیں ہم
سرِ بازار یورشِ دشنام — بارشِ سنگ مجمعِ الزام
کوئے جاناں میں ہوجنوں صیقل — تہمتِ عشق کو جلا دیں ہم
تم خریدارِ شوق ہو تو سہی — جاں متاع گراں بہا کیسی
اعتبارِ وفا نثار کریں — درد کی آبرو لٹا دیں ہم

○

سرِ بازار ہو کہ مقتل ہو پھر چلیں جاں کو دردمند کریں
تہمتِ عشق کا تقاضہ ہے پرچم عشق سربلند کریں
رہگزارِ وفا پکارتی ہے وہ نظر آرتی اتارتی ہے
اب یہ دفتر لہو رقم ہوگا وقت ہوا میکدے کو بند کریں
ہر لمحہ آج جاں پہ بھاری ہے فیصلہ کی پکار جاری ہے
سوچنے کی گھڑی گزر بھی چکی چلیے جاں کا زیاں پسند کریں

30-10-78

○

تیری شہرت بھی بہت اور میں رسوا بھی بہت
شہر میں ہوگا مرے قتل کا چرچا بھی بہت

غمِ دنیا نے مرا ذوقِ جنوں چھین لیا
کارفرما تھا وگرنہ دل زندہ بھی بہت

دکھ اٹھایا ہے کوئی جب بھی کسی کے ہاتھوں
یاد آیا ہے ترا چہرۂ زیبا بھی بہت

اب کے باقی نہ رہے زخم و گریباں کی تمیز
اب کے پھیلے گا لہو، ہوگا تماشا بھی بہت

☆☆

ہم نے بھی گزاری شب میکدہ لیکن
کچھ اس میں مزہ کوچۂ قاتل کا نہیں ہے
اندازِ تغافل نہ اندازِ محبت
یہ رنگ تو یاروں میرے قاتل کا نہیں ہے

تین شعر

نہ کوئی وصل کی ساعت نہ کوئی ہجر کی رات
ترے لمس کو ترسنے لگے ہیں پیار کے ہات

کھڑا ہوں اس طرح تیرے ستم کے سائے میں
کٹا ہوا سر ہے شانوں پہ چور چور ہیں ہات

رفو کریں جو ملے اپنے پیرہن کی خبر
کہ جسم پر ہے سجی زخم روز و شب کی برات

تین شعر

پھر ہر اک زخم لہو دینے لگا ہے یارو
پھر کسی شوخ سے تجدید وفا کرلیں گے

کیا خبر پھر یہ شب ہجر ملے یا نہ ملے
قرض ہے تذکرۂ یار، ادا کرلیں گے

جن کو رکنا ہے سرِ راہ گذر رک جائیں
فاصلے کانٹوں کے طے آبلہ پا کرلیں گے

○

نہ کھل سکیں گی اگر کھڑکیاں تو ٹوٹیں گی
مکاں کا حبس ہوا آئے گی تو جائے گا

یہ قافلہ جو سر رہگذار ٹھیرا ہے
کسی جرس کی صدا آئے گی تو جائے گا

ہمارا دل جو بوئے گل کے ساتھ ساتھ رہا
تیرے دیار صبا آئے گی تو جائے گا

یہ اک لمحہ جو ٹھہرا ہے کرب کی مانند
لہو میں ڈوبی قبا آئے گی تو جائے گا

☆☆

متاعِ درد دل بے قرار باقی رہے
یہ شب رہے نہ رہے انتظار باقی رہے
تمام عمر کی مے نوشیوں سے کیا حاصل
ملے وہ جرعہ کہ جس کا خمار باقی رہے

○

حصارِ جسم و زماں و مکاں کی بات نہیں
مجھے تنہائی کی سرگوشیوں نے گھیرا ہے

جہاں پہ دھوپ ہے جلنے لگے ہیں جسم وہاں
جہاں پہ سایہ ہے پر ہول سا اندھیرا ہے

برستی آگ ہے کوڑے ہیں اور جلتی زمیں
نظامِ عہدِ ضیاء کا نیا سویرا ہے

مجھے شکایتیں جو کچھ ہیں دوستوں سے ہیں
کہ دشمنوں نے کبھی یوں نہ مجھ کو گھیرا ہے

ہر ایک شخص کو اپنی انا کی چاہت ہے
یہاں نہ کوئی ہے تیرا نہ کوئی میرا ہے

غبار دیکھ کے سمجھے تھے کارواں ہوگا
کھلا تو یہ کہ فقط آندھیوں کا پھیرا ہے

○

اس عہد کے سب زخم سجے ہیں مرے تن پہ
اے چارہ گرو مجھ سے ملاقات تو کرتے

ڈرتے ہو اگر تیرگیٔ شب کے فسوں سے
کچھ تیرگیٔ شب کے سوا، بات تو کرتے

اچھا نہ سہی ، تذکرۂ یار نہ ہوتا
کچھ شکوۂ بے رحمیٔ حالات تو کرتے

ہوتے جو میسر ہمیں دامان و گریباں
اے دست جنوں تیری مدارات تو کرتے

نکلا نہ کوئی گھر سے صدا پہ مری اس وقت
اب لوگوں کو شکوہ ہے کوئی بات تو کرتے

☆☆

نہ رک سکے گی کسی رہزن سے کہکشاں کی بارات
نہ بجھ سکے کوئے جاناں کے جستجو کے چراغ

O

جاڑوں کی پہلی بارش نے
دھرتی کو کیا حسن دیا ہے
دل میں اترنے والی ٹھنڈک
اور مٹی کی سوندھی خوشبو
شہر کے کچے فٹ پاتھوں پر
چھوٹے چھوٹے میدانوں میں
گھروں کے آگے کچی زمین پر
جھاڑی کونپل پیڑ پنیری
چاروں جانب پھول ہی پھول ہیں
سرخ گلابی اور نارنجی
اودے پیلے اور سفید
ہر سمت اتنے پھول کھلے ہیں
جیسے کچھ بھی نہیں دھرتی پر
پیار بھرے پھولوں کے سوا

اب جنگ نہ ہونے دیں گے

ماؤں کی ممتا زندہ رہیگی
اور بچوں کی دلکش ہنسی
روشن اور تابندہ رہیگی
بارش کے قطروں کی رم جھم
پیار کے بول سنائے گی
جذبوں کی شدت چہروں پر
سرخ گلاب کھلائے گی
وادی وادی پربت پربت
شہر نگر قصبہ دیہات
گھر اور بچوں کے اسکول
دھرتی کے رشتے پیار اور محنت
سب کا حسن جواں رہیگا
ہم اب جنگ نہ ہونے دیں گے
ہم اب جنگ نہ ہونے دیں گے

سورج گہن

انسانوں کا سورج سے رشتہ
سب سے پرانا رشتہ ہے
سانس کی ڈوری، جسم کے رنگ
بینائی کی قوسِ قزح
علم کی کرنیں، سوچ کی سمتیں
پیار کے قدموں کے نیچے پھیلی اجلی کہکشاں
سرکش ذہن، توانا بازو
یہ سب دین ہیں سورج کی
اسی لیے ہم انسانوں کو سورج سے ہے پیار بہت
پہلے لوگ سمجھتے تھے
جب سورج گہن میں آتا ہے
راہو اس کو نگلتا ہے
لوگ عبادت کرتے تھے اور قربانی دیتے تھے
تاکہ ان کا پیارا سورج گہن سے نکلے
آج کا انساں جان گیا ہے
سورج اتنا طاقتور ہے
کوئی راہو اب سورج کو نگلنے کی
کوشش بھی نہیں کر سکتا

18-2-80

○

دریا خشک نہ ہو سیلاب اگر آتا ہو آئے
دعا کرو بارش کی یارو چاہے گھر بہہ جائے

گلیوں گلیوں پھر کر ہم نے شہر کے دکھ اپنائے
اوروں کی خاطر جلتے ہیں سورج کے ہمسائے

اک کرن شیشے سے گزرے سات رنگ پھیلائے
اپنی سوچ تو سورج ہے پھر کیوں نہ ہولی منائے

کیوں الزام چراغوں کے سر بینائی کا آئے
چہرہ تو پھر چہرہ ہے ہر رنگ پہچانا جائے

آ جاؤ تو دل کی لہر پر ہلکورے لیں پھول
جاؤ تو تنہائی خوشبو کا جھونکا بن جائے

آنکھیں ایسی سمندر آنکھیں کب دیکھی تھیں ہم نے
چہرہ جیسے شامِ مے کا رنگ نکھرتا جائے

کہیں سے پھولوں کی خوشبو کہیں سے رات چلی
ہوا چلی، ترے آواز پا کی بات چلی

ستارے سارے اتر آئے جیسے دریا میں
ہجوم یاد نگاراں چلا، برات چلی

سجا ہے خاک سے ماتھا تو کشتنی ہوگا
ترے شہر میں عجب رسم عجیب بات چلی

یہ رسم کیا ہے بتاؤ شہر کے راہزنوں
مشعل اٹھا کے چلی جب کوئی برات چلی

نجانے کون گیا ہے ادھر سے کہتا ہوا
ہمارے سر پہ جو آئی تھی کالی رات چلی

تیز ہواؤں نہ بجھا پاؤ گی تم سارے چراغ
کچھ بھڑک اٹھتے ہیں اور آگ لگا دیتے ہیں

دستِ قاتل کی جو تعریف کیا کرتے ہیں
وہی لوگ ہم کو بھی جینے کی دعا دیتے ہیں

بستیاں جلتی ہوئی چھوڑ کے کیوں یہ بادل
اپنا سب پیار سمندر پہ لٹا دیتے ہیں

سچ تو یہ ہے ہمیں سچ بولنا آتا ہی نہیں
ہم ہر اک کو نیا افسانہ سنا دیتے ہیں

☆☆

آپ کے حسن کے چرچے ہی نہیں شہر بہ شہر
دیس پردیس ہماری بھی ہے رسوائی بہت
وحشتوں کو مری احسان گوارا نہ ہو
درد نے کی تھی دل و جاں کی پذیرائی بہت

بانہوں میں بانہیں ڈال کے دونوں سفر کریں
تسخیر کہکشاں کی مہم ساتھ سر کریں

مانوس جسم ذہن شناسا کا ساتھ ہو
یہ وصل ہو تو زندگی ساری بسر کریں

ہر سمت ہو ہواؤں میں خوشبو بسی تری
دیوار و در کو توڑ کے میداں میں گھر کریں

میری طلب کو منت تسکیں نہیں قبول
دریا کی پیاس دیکھ کے مجھ پر نظر کریں

ترکِ تعلقات بھی کرنا پڑے تو ہم
دریا کے ساتھ جیسے کنارے سفر کریں

اس نے سچ کو چھوا
اور قتل ہو گیا
وقت کے ماتھے پر لکھی تحریر کو پڑھ لیا
اس نے تازہ ہواؤں کا نغمہ سنا
اس نے دیکھا
سیاہی سمٹ جائیگی
جھوٹ اکھڑ جائیگا
اس نے سچ کو چھوا
اور اس جرم میں
سینہ چھلنی ہوا
پشت زخمی ہوئی
شب کے سناٹے میں
قتل ہوتا رہا
لیکن اس کا وہ سچ

قتل ہو نہ سکا

قاتلوں کو بھی اب جھوٹ کہنے کی ہمت نہیں
جھوٹ تو مر گیا
اس نے سچ کو چھوا
اور قتل ہو گیا
پھر بھی زندہ رہا

30-3-80

○

جاتے جاتے اس منزل پہ پیڑ ہم اک بو جائیں گے
پھل اور سایہ ہم نہ پائیں آنے والے پائیں گے

سوچ لیں پھر، یہ ترکِ تعلق آپ کو راس نہ آئے گا
ہم تو دل کو بہلالیں گے آپ مگر گھبرائیں گے

پل کے ستونوں نے دریا کی لہروں کو سمجھایا ہے
دھرتی میں جو پیر گڑے ہوں وہ نہ اکھاڑے جائیں گے

چڑیوں کی چہکار سے جنگل کا سناٹا ٹوٹ گیا
کیوں چپ ہیں یہ بستی والے آؤ انہیں سمجھائیں گے

ہم کو جتنا وقت ملا تھا نقش ترے چہرے کے ابھارے
عارض و لب کے رنگ سجانے اور مصور آئیں گے

☆☆

ہیں کہکشاں میں بھی جنوں کی بستیاں
کچھ قرض راہِ عشق وہاں بھی ادا کرو

○

ذہن پر اتنا دباؤ شہر میں اس درجہ حبس
بے وجہ بے بات بھی آپس میں لڑ جاتے ہیں لوگ

اب کسی کو اعتبار امروز و فردا کا نہیں
ہر کسی حاکم کے لہجے سے ہی ڈر جاتے ہیں لوگ

شام کو سڑکوں پہ گرد آلود چہروں کا ہجوم
جیسے قبرستان سے اٹھ کر کے گھر جاتے ہیں لوگ

اب تو ہر اک موسم میں زر کی طلب ہے اوّلین
رسم پوری کرتے ہیں چپ چاپ مرجاتے ہیں لوگ

اپنی قامت کا جب اندازہ کوئی رہتا نہیں
اپنے سایہ سے بھی ڈرتے ہیں سکڑ جاتے ہیں لوگ

☆☆

کارِ دنیا وبال ہوگیا
عشق کرنے کی فرصت نہیں

○

مانوس جسم ذہن شناسا کا عشق ہے
تو میری ذات ہے تو مجھے تیرا عشق ہے

میرے تصورات کا ہالہ ہے تیرے گرد
سچ یہ ہے مجھ کو اپنی تمنا کا عشق ہے

مصلوب کرسکوں گا نہ اپنی انا کو میں
میری انا ہے زندہ تو پھر زندہ عشق ہے

خلقت میں کس کا دل ہے جسے عشق نہ ہوا
مثل گنہ خلق میں کیوں رسوا عشق ہے

☆☆

شہر کے سارے دریچوں پہ نکھار آیا ہے
موسمِ گل تجھے کس شوخ پہ پیار آیا ہے
نہ کوئی حرف نہ پیغامٔ اشارہ نہ سلام
تیرا دیوانہ ہر ایک سمت پکار آیا ہے

○

یارو لہو جلاؤ اجالا تو رہ سکے
چہروں کا آفتاب سے رشتہ تو رہ سکے

بادِ خزاں کے موسموں اتنا تو سوچ لو
جینے کی ہر شجر میں تمنا تو رہ سکے

شعلوں کا جسم لے کے میں بازار میں پھروں
بستی میں تھوڑی دیر تماشا تو رہ سکے

اتنا بڑھا نہ سلسلۂ ساعت ہجراں
تجھ سے مرے نباہ کا لمحہ تو رہ سکے

زخموں کے پیراہن میں کہیں چھپ نہ جاؤں میں
بستی میں میرا جسم شناسا تو رہ سکے

مصلوب ہو نہ جائیں کہیں سارے آئینے
میری نظر میں خود میرا چہرہ تو رہ سکے

○

بلندیاں جو سفر اختیار کرتی ہیں
تو زادِ رہ میں صلیبیں شمار کرتی ہیں

ہوا پکڑنے کی کوشش جو طفل کرتے ہیں
یہ خواہشیں ہیں جو اپنا اظہار کرتی ہیں

یہ کونپلیں جو ابھی پتھروں سے پھوٹی ہیں
مرے لہو کی صفت آشکار کرتی ہیں

جہاں صدائے سلاسل کے کارواں ہیں رواں
وہ شاہراہیں مرا انتظار کرتی ہیں

حسین تتلیاں اڑتے ہوئے زمانے سے
مری نگاہ کا لمس استوار کرتی ہیں

☆☆

دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو کہ محشر
کوئی بھی مرے ذکر سے خالی نہیں رہتا

اک نہ اک میرا سہارا ہی سہی
تو نہیں ہے ترا سایہ ہی سہی

کر بھی کیا سکتے اور ہم ایسے
زندگی صرفِ تمنا ہی سہی

کل بھی تیرے بنا گزارا تھا
آج کا دن پھر ایسا ہی سہی

دیکھنے والوں میں گر تم بھی ہو
پھر ہمارا بھی تماشہ ہی سہی

ہم کو دریا کی سطح پر دیکھو
دائرہ ہی سہی نقطہ ہی سہی

9-6-80

مجھے بہلاتے ہو جب کہتے ہو کل آؤ گے
وقت کی لہروں پہ کل دور نکل جاؤ گے

برق رفتار ٹریفک میں ٹھہر کر نہ چلو
لمحے کے لاکھویں حصے میں کچل جاؤ گے

پہلا دھوکہ تھا جو اس درجہ شکستہ دل ہو
اور اک دھوکہ جو کھاؤ گے بہل جاؤ گے

مفلسی عشق کو زندہ نہیں رہنے دیتی
تم مرے ساتھ اگر آئے بدل جاؤ گے

اک کانٹا سا کھٹکتا ہے اسے کیا کہیے
ہم تو سمجھے تھے کہ تم دور نکل جاؤ گے

یونہی اٹھتی رہیں گر اونچی فصیلیں ہر سمت
تم بھی ان حبس کی دیواروں میں ڈھل جاؤ گے

پتھروں کے جو یونہی ساتھ رہو گے رضوی
تم بھی کچھ دیر میں پتھر میں بدل جاؤ گے

○

کچھ تذکرۂ درد حکایات کیجیے
یارانِ گمشدہ سے ملاقات کیجیے

پھر عشاء کے وضو سے پڑھیں صبح کی نماز
دن ہو تو میکدہ میں اسے رات کیجیے

سرمستیوں میں چومیے لب لعلِ یمن کے
اس جسمِ مرمریں کی مدارات کیجیے

انگاروں پہ سر رکھ کے سرِشام سوئیے
سوتے میں اس سے اس کی شکایات کیجیے

واعظ نہیں ہے کفر کی لذت سے آشنا
بت خانہ میں ساتھ اس کے بسر رات کیجیے

دیوانوں میں ہو چاک گریباں کی نمائش
فرزانوں میں فرزانوں کی سی بات کیجیے

جس بے رخی سے جھٹکا امیرِ شہر کا ہاتھ
اس واقعہ پہ فخر و مباہات کیجیے

یاران گمشدہ سے ملاقات کیجیے
کچھ تذکرہ درد حکایات کیجیے

☆☆

تیرا بدن کہ جوانی کی کروٹیں جیسے
یہ رنگ عارض ولب جس طرح حجاب کا رنگ
طلسم خانۂ قامت خرام نکہت گل
ادائیں ایسی کہ اٹھ جائے زندگی کی طلب
نظر میں شوخی و مستی و سرخوشی و ترنگ

O

قحطِ یاراں میں پکاریں کس کو
غمِ جاں نذر گزاریں کس کو

اب وہ محرابِ رخِ یار کہاں
آنسو اُمڈیں تو سنواریں کس کو

اب تو رکتا ہی نہیں یہ سیلاب
ڈوب کر پار اتاریں کس کو

درِ زنداں سے پوچھ آتے ہیں
اب ترے نام پہ واریں کس کو

جانے کب سے خزاں کے عہد میں ہیں
یاد آئیں گی بہاریں کس کو

کارواں چراغ راہ نظر
جانے والوں میں پکاریں کس کو

O

دیارِ دل میں کوئی احتیاط کیا کرتے
ہم ابتدا ہی سے نکلے تھے انتہا کرتے

طلب کے دشت میں کچھ اس طرح جیا کرتے
ہوا کے چہرے پہ ایک نام ہم لکھا کرتے

دلوں کے زخم تہہِ آب لے چلے دریا
وگرنہ شہر میں سیلاب ہی بہا کرتے

سواد دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
یہ عمر بیت چلی تجھ کو آشنا کرتے

بھٹکتے پھرتے یونہی جنگلوں میں لوگ اگر
کسی کے گاؤں سے آنے کا آسرا کرتے

جان پر کھیل گئے ہم تو کوئی بات نہیں
اس سے بہتر کوئی اس کے لیے سوغات نہیں

نقشہ شہر میں تخریب مضافات تو ہے
یہ الگ بات کہ تعمیر مضافات نہیں

میرے ہاتھوں کی حرارت سے پگھلنے والے
کیا ترے دیس میں اب رسمِ ملاقات نہیں

میں اسے ترکِ تعلق کہوں یا کچھ نہ کہوں
وہ خفا مجھ سے ہے ایسے کہ کوئی بات نہیں

اے بخیہ گرو
کوئی چاک سیو
ہر دامن غم سے دریدہ ہے
ہر آس کا سینہ عریاں ہے
ہر موتی خاک میں رلتا ہے
کوئی چاک سیو
اور رشتہ جیب و داماں کی
تجدید کرو
اک قرض ہے تارِ پیراہن
اک قرض ہے زخموں کا پرچم
یہ دامن بھی سل جائے گا
یہ پرچم بھی اُٹھ جائے گا
پھر یوں نہ ہو
جب دستِ جنوں کا ساتھ چھٹا
پھر راندہ موسمِ گل ہو کر
تم کس بستی میں جاؤ گے
اے بخیہ گرو

12-11-80

وہ آواز

نسیمِ صبح کی ٹھنڈک کا لطف وہ آواز
یا جیسے دور ستاروں میں بج رہے ہیں ساز

مہک رہی ہے خود اپنے خیال کی خوشبو
بدل رہی ہے یا قوس قزح نئے انداز

وہ اجنبی مگر اپنائیت کے لہجہ میں
کھلی کتاب کے حرفوں کے زیر و بم کے راز

سلگتی آنکھوں میں ٹھنڈک کی لہر کی مانند
بہت ہی نرم سروں میں سجے نشیب و فراز

وہ بانکپن کہ نہائے ہوئے شعاعوں میں لفظ
کہ جیسے نیلے سمندر پہ ہنس کی پرواز

☆☆

سمجھے ہوئے اس کو مرے اختیار میں
باہر ہے جو تمہاری حدِ اختیار سے

○

میری خواہش ہے کہ اس دور کا انساں دیکھوں
نیا انساں کہ جب
میری تاریخ کے اوراق پہ جمتی ہوئی خاک
صاف کرنے کی ضرورت بھی نہ محسوس کرے
جس کو معلوم نہ ہو
بھوک و محتاجی و افلاس کسے کہتے ہیں
ظلم کیا شے ہے - اور اسکے اجداد
کس طرح ظلم میں پس جاتے تھے
کبھی اپنوں کبھی غیروں کی غلامی کے لیے
اپنی پیشانی نہ سجدے سے اٹھا پاتے تھے
عشق کرتے تھے اگر لوگ سزا پاتے تھے
جس کو معلوم نہ ہو
جنگ ہتھیار تھا ایک لوٹ بڑھانے کے لئے
منڈیاں چننے اور انسان گنوانے کے لئے
ہوس زر وہ بلا تھی کہ مداوا جسکا
ڈھونڈتے ڈھونڈتے انسان کو جگ بیت گیا
جس کو یہ یاد نہ ہو

کس طرح لوگ شب زنداں میں
نئی صبح کی دعا کرتے ہوئے
اپنی بینائی گنوا دیتے تھے
کوڑوں سے پشت سلگ اٹھتی تھی
بیٹیاں فاطمہ و سیتا و مریم جیسی
آگ کے جلتے الاؤ میں اتر جاتی تھیں
لوگ لڑتے ہوئے مر جاتے تھے

میری خواہش ہے کہ اس دور کا انساں دیکھوں
وہ جو انسان کے رشتہ کو سرافراز کرے
جستجو صدیوں کی جب پائے اسے ناز کرے
آدمیت کا شعور
جسکی بنیاد بنے
جس کی فطرت ہو محبت کا خمار
جسکے احساس میں جلتے ہوں چراغ
اپنے ساتھی کو لڑکھڑانے نہ دے
زندگی کو فریب کھانے نہ دے
جو خلاؤں میں سفر کرتا ہو
کہکشاں راہ گزر کرتا ہو

جس کی باتوں میں دھنک کے سب رنگ
جس کی آہٹ سے کھلے جاتے ہوں آفاق کے انگ
گنگنائے تو ستاروں کی چمک بڑھ جائے
کہکشاؤں سے ہنسی اس کی پلٹ کر آئے
دیس پردیس کے سیاروں کے سب لعل و جواہر لا کر
اپنی محبوبہ کے قدموں پہ نچھاور کر دے
اس نئے دور کے انسانوں کو
آج کے عہد کے شاعر کا سلام

30-4-81

○

کیسے خوابوں کی سرزمیں پہ ہوں
نیند پلکوں پہ مری جلتی ہے

ہر نئے موڑ کے ساتھ اسکی یاد
اک نیا زاویہ بدلتی ہے

کیسا سناٹا سارے شہر میں ہے
کیسی آندھی گھروں میں چلتی ہے

☆☆

اے جانِ جہاں اپنی جفائیں بھی تو دیکھو
جو منحرف ہوجائے کوئی راہِ وفا سے
رہرو بھی ہیں رہبر بھی ہیں رہزن بھی ہیں اپنے
پھر کس کا پتہ پوچھیے نقشِ کفِ پا سے

○

مہکے گا کہیں زخم کہیں پھول کھلیں گے
ان تازہ ہواؤں سے نئے داغ ملیں گے

ہم آج بھی آزردہ نہیں اپنے جنوں سے
وہ فصل بھی آئے گی کہ جب چاک سلیں گے

کشتی کو سمندر کا سکوں بھاری پڑے گا
امڈے ہوئے بادل جو سمندر سے ملیں گے

☆☆

کچھ سخن ایسے بھی تمام ہوئے
لفظ ادھورے تمہارے نام ہوئے
میری وحشت میں کیا نظر آیا
آج کچھ لوگ ہم کلام ہوئے

○

سمندروں میں جو طوفاں سر اٹھائیں گے
تمام قیدی جزیروں کے ڈوب جائیں گے

یہ سوکھے پتے جو چمٹے ہوئے ہیں پیڑوں سے
ہوا چلے گی تو سڑکوں کی خاک اڑائیں گے

تم ان شکستہ سفینوں کو ریت پر رکھو
سمندروں میں گر اترے تو ڈوب جائیں گے

اپاہجوں کا مقدر ہے رہ کی ایک ٹھوکر
یہ گر پڑے تو سہاروں سے اٹھ نہ پائیں گے

کھلی ہوا میں نکل آئے اڑ کے شب کے پرند
سحر قریب ہے کرنوں میں پھنس نہ جائیں گے

ہمارا نام بہت معتبر سہی لیکن
ہمارے نام پہ کتنے فریب آئیں گے

بیروت کی ایک تصویر

آگ اور دھوئیں کے سائے میں
ایک مکان کے ملبے سے
اک چھوٹے بچے کی مٹھی نکلی ہوئی ہے
پاس گلاب کے پودے پر
اک سرخ پھول کھلا ہوا ہے
ایک فلسطینی کہ جس کی آنکھیں لہو ہیں
ہاتھوں میں ہتھیار سنبھالے
کھڑا ہوا ہے
اک مٹھی 'اک سرخ پھول ایک مجاہد
یہ زندہ بیروت ہے

11-7-82

نوٹ: 1982ء کی لبنان جنگ کے دوران اقوام متحدہ کی طرف سے نافذ کی گئی جنگ بندی کے ٹوٹنے کے بعد اسرائیل نے بیروت شہر کا محاصرہ کرلیا تھا جون میں شروع ہونے والا محاصرہ دو ماہ تک جاری رہا۔

○

جھونکا تازہ ہوا کا کہہ گیا ہے
زندانوں کی آبرو ہی کیا ہے

شب ٹوٹ گئی ہے جگہ جگہ سے
یہ ایک دئے کا حوصلہ ہے

سب لوگ اسی سمت آ رہے ہیں
کوڑوں کی صدا بھی راستہ ہے

بوسیدہ نظام بام و در ہے
سیلاب صحن میں رک گیا ہے

آتے لمحوں کی چاپ سن کر
سناٹا سڑک کا بول اٹھا ہے

مظلوموں کے ہجوم ہشیار
قاتل کا نیا روپ رہنما ہے

○

مجھ کو دس سال کی زنداں کی سزا دیتے ہو
مجھ کو بے نام گناہوں کی جزا دیتے ہو
میں تو دس سال رہوں یا نہ رہوں
تم کو دس لمحوں کی مہلت بھی نہ مل پائے گی
وقت کی آندھی کسی ساعت بھی
ظلم کی کوڑھ سے سڑتے ہوئے جسم
کسی ویرانے میں پھینک آئیگی

10-11-82

بازارِ وفا آج طلبگارِ وفا ہے
نکلو کہ دل و جاں کا بہت نرخ سوا ہے

قاتل کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ نہ روکو
یاروں کے لئے آج کا دن روز جزا ہے

لہراتے ہوئے ہاتھوں نے تاریخ لکھی ہے
گرتے ہوئے جسموں نے لہو رنگ دیا ہے

بجھتا ہے جو اک بار تو جل اٹھتا ہے سو بار
شعلوں کا تسلسل ہے جو مٹی کا دیا ہے

21-8-83

☆☆

وحشت دل بھی راس نہ آئی دشت میں بھی آرام نہ آیا
سب کو چھوڑ جنوں اپنایا وہ بھی اپنے کام نہ آیا
طرز ستم کا ذکر ہی کیا ہے حسن بیاں کی بات کرو
میرے فسانے سب کہہ ڈالے اپنا کہیں بھی نام نہ آیا

ساتھیو اٹھو

آواز دے رہا ہے وطن ساتھیو اٹھو

اٹھو کہ جیسے شیر گرجتا ہوا اٹھے
یا جس طرح عقاب جھپٹتا ہوا اٹھے
نکلو کہ جیسے تیر کماں سے نکل چلے
ابلو کہ جیسے آگ کا دریا ابل پڑے
تم آندھیوں کی کاٹ ہو طوفاں کا بانکپن
ساتھیو اٹھو
اٹھو کہ جرنلوں کی حکومت تباہ ہو
امریکہ کے غلاموں کی قوت تباہ ہو
دریائے سندھ میں نیا فرعون غرق ہو
جل جائے جس سے آمریت ایسی برق ہو
ٹوٹے ہر ایک ظلم کا بت تم ہو بت شکن
ساتھیو اٹھو

اٹھو غرور کج کلہی ٹھوکروں میں ہے
ان فوجی آمروں کی شہی ٹھوکروں میں ہے
کوڑوں کو انکے واسطے ناگوں میں ڈھال دو
فوجی عدالتوں کے جنازے نکال دو
ٹھوکر سے دور پھینک دو سڑتے ہوئے بدن
ساتھیو اٹھو
جمہوریت کا نعرہ مستانہ چاہیے
یہ جنگ ہے عوام کی درانہ چاہیے
قاتل کے ہاتھ سے رسن و دار چھین لو
دستِ ستم کو توڑ کے تلوار چھین لو
ہاں بے بسی کی موت ہے تقدیر اہرمن
ساتھیو اٹھو
جہلم کی وادیوں کے گرانڈیل نوجواں
سرحد کے سنگلاخ چٹانوں کے پاسباں
بلوچ کے غیور جوانوں جواب دو
للکارو آمروں کو لہو کا حساب لو
ڈوبے ہیں جس لہو میں ہمارے سرو سمن
ساتھیو اٹھو

پرچم بلند کر کے اٹھے سندھ کے جواں
دھرتی کے راگ گاتے ہیں دھرتی کے نغمہ خواں
شاگرد ہاری شہر کے کچلے ہوئے عوام
اپنے لہو سے لکھتے ہیں جمہوریت کا نام
ہر گاؤں گوٹھ دشت وجبل میں پڑا ہے رن
ساتھیو اٹھو
ہم فوجی آمروں کو فنا کر کے لیں گے دم
سینے پہ سامراج کے رکھتے ہیں ہم قدم
ہاں ساتھیو بڑھو کہ بس ایک وار اور ہے
بس اک وار ظلم کے نزع کا دور ہے
جو پیرہن ہے اس کا وہی اس کا ہے کفن
ساتھیو اٹھو

1-9-83

ہوا کے شور میں آواز پا سنائی دے
ہر ایک سمت تمہاری صدا سنائی دے

حصارِ شہر کی بے آبروئی بھی دیکھو
ہوا کے دوش پہ لہجہ مرا سنائی دے

جہاں جہاں کہیں تیرے ستم کی بات چلے
ہمارے لہجہ میں نامِ وفا سنائی دے

دھنک کے جسم میں صبح اتر گئی ہو گی
چھوؤ تو نغمۂ بادِ صبا سنائی دے

نہ جانے کیسے دوانے کو موت آئی ہے
تمام دشت لہو کی صدا سنائی دے

2-2-84

تین شعر

ابھی تو چاک گریباں میں تار باقی ہے
ابھی جنوں پہ مرا اختیار باقی ہے

گئی نہ ترکِ محبت سے آرزو تیری
میں جل کے راکھ ہوا اور شرار باقی ہے

ہے ترکِ عشق میں بھی عشق ہی کا افسانہ
مسافرت ہے وہی، رہگذار باقی ہے

☆☆

دل اور محیط آرزوئے محشر خیال
وحشی کے ساتھ وسعت صحرا سفر میں ہے
ہلچل ہے کائنات میں میرے وجود سے
لہروں کے دائروں کا تماشا سفر میں ہے

تین شعر

اک مست کی ٹھوکر کے آگے سب شیشے کے گھر پتھر تھے
ایک جام کی خاطر توڑ دیئے سب لعل و جواہر پتھر تھے

بستی کے بسانے والوں نے کچھ سوچ کے ہی جانیں دی تھیں
اک جنگل شہر کے باہر تھا اور شہر کے اندر پتھر تھے

اے کوچہ جاناں پہلے بھی تھی رسم یہی دیوانوں کی
اک آن کی خاطر دے ڈالے سب شانوں پہ سر پتھر تھے

☆☆

انسان کی اکائی بھی بڑی چیز ہے یارو
ہر قصہ شروع کرتے ہو تم یاں من و تو سے
جو ہے ہمیں ساقی کی نگاہوں سے گلہ ہے
نہ مے سے شکایت نہ کوئی جام و سبو سے

ملک محمود کے نام

بجھ گیا ہے چراغ حسرت دید
باقی شب کی مسافتیں ہیں ابھی

کھوگئی ہے نگہ راہ شناس
اور سرِ راہ زحمتیں ہیں ابھی

ہو گیا سرد زندگی کا لہو
تشنہ کتنی محبتیں ہیں ابھی

آرزو کی کسک کو بڑھنا تھا
قہرِ جاناں کی ساعتیں ہیں ابھی

اس ملامت گہِ جنوں میں دوست
جانے کتنی قیامتیں ہیں ابھی

راستے میں بچھڑ گیا ساتھی
اور ہم کو مسافتیں ہیں ابھی

18-12-84

نوٹ: **ملک محمود ایک دوست جن کا اسٹیل ٹاؤن میں ایک حادثہ میں انتقال ہوگیا۔**

تین شعر

دل کی اداسیاں بھی نیا وار کرگئیں
وحشت زدہ کو نقش بہ دیوار کرگئیں

خاموشیوں کا دشت بھی مجھ پہ گراں رہا
آوازیں میری مجھ کو ہی سنگسار کرگئیں

مٹی کے گھر تو راہ سے ہٹ کے بنائے تھے
جانے ہوائیں کیوں انہیں مسمار کرگئیں

☆☆

ٹوٹ کے امڈی گھٹا ایسی کہ بس کیا کہیے
موسمِ باراں نے وہ دل پہ خرابی کی ہے
ہر بن مو سے لہو درد کی مانند رواں
ٹوٹ کے ایسے بھی ساون کی گھٹا برسی ہے

○

ایک گم گشتہ کھلونے کا سا احساس لئے
ڈھونڈنے آئے کوئی بیٹھا ہوں اک آس لئے

تم ملو یا نہ ملو عمر تو طے کرنا ہے
کوئی خوشبو نہ سہی زخم کئی پاس لئے

ہجر کی صدیوں پہ بھی نام ہمارا نہ ہو
ہوئے تاریخ وہ چند سال کا بن باس لئے

ساقیا جام و قدح سے مری پہچان نہیں
سیلِ دریا کی روانی ہے مری پیاس لئے

○

دعا کرو کہ سلامت رہے جنوں کا وقار
دعا کرو کہ سرِ شاخ دار پھول کھلے
دعا کرو کہ دل بے اختیار زندہ رہے
لہو کو کوچہ دلدار کی امنگ ملے

دعا کرو کسی وحشی کا جسم چھلنی ہو
لہو کے چھینٹوں سے ہو رونقِ در و دیوار
کسی دوانے کی ہشیار باش کی آواز
کہیں پہ طوق و سلاسل کی آتشیں للکار

کوئی مسافر شب رہزنوں سے ٹکرائے
سپاہ اہل ستم پہ ستم زدہ جھپٹے
مذاق آدمیت مسخ کرنے والوں پہ
گرجتی گونجتی طوفان کی ہوا جھپٹے

وہ کرب جس میں گزاری تمام شب ہم نے
وہ کرب ایک لمحہ میں قرار کو پہنچے
تمام عمر گلی کوچوں میں صدا دے لی
دعا کرو کہ یہ منصور دار کو پہنچے

تین شعر

نہ مجھ کو فکر ہے اسکی نہ اس کو میری فکر
مرے مکان میں رہتا ہے اجنبی کوئی

فسونِ چہرہ گری سے نہ جانے کب نکلے
پریشاں آئینہ خانے میں آدمی کوئی

یہ سلسلہ ہے کہ جب بھی افق پہ پہنچا ہوں
نئے افق پہ نظر آئی روشنی کوئی

O

اس درد کے لاکھوں پہلو ہیں اتنے کہ بتا نہ پائیں ہم
سب موتی ہیں سب کنکر ہیں کیا چھوڑیں کیا اپنائیں ہم

گر پیار نہیں کرتے نہ کرو ہم آئیں تو آزار نہ دو
بنجارے ہیں دل نگری کے ٹھہریں کہ یہاں سے جائیں ہم

اس بزم کی رونق ہے وحشت، وحشت جو تمہاری چاہت ہے
کیا باقی یہاں رہ جائے گا اس بزم سے گر اٹھ جائیں ہم

کنکر پتھر کی چاہ نہیں یہ جاں کا زیاں یہ پروازیں
مرتے ہیں کسی سیارہ پہ اک دل کو دھڑکتا پائیں ہم

جو لمحہ غم دنیا کا ہے وہ لمحہ تیری یاد کا ہے
دن رات الجھتے رہتے ہیں کیا چھوڑیں کیا اپنائیں ہم

☆☆

ہم بناتے ہیں یقین و علم کا ایسا خمیر
خاک کے ذرّوں سے پیدا کر رہے ہیں آفتاب

O

خوشبوئیں جانی پہچانی رنگ انجانے لکھے ہیں
تم سے بس ایک بار ملے ہیں سو افسانے لکھے ہیں

کوئی نہ کوئی بات تو ایسی تیری محفل میں ہوگی
ہم سے ہوش میں رہنے والے سب دیوانے لکھے ہیں

ملنے کوئی آئے نہ آئے دل کی تسلی کی خاطر
دل پر ہم نے نام کئی جانے پہچانے لکھے ہیں

وحشت کے افسانوں کو جو ہم نے لکھے ہیں سچ نہ جان
سچ تو یہ ہے ہم نے سب ملنے کے بہانے لکھے ہیں

تم سے تو اک پل ہی ملے تھے لیکن یہ بھی جھوٹ نہیں
ہم نے اپنے شعر میں جو صدیوں کے زمانے لکھے ہیں

زندگی بھی عجب تماشا ہے
زخم ہے اور چارہ ساز نہیں

ایک بیداد گر جنس وفا
اور وفا کا کوئی دمساز نہیں

عشق سب سے چھپائے پھرتے ہیں
ہائے وہ راز کہ جو راز نہیں

اتنا نہ آزمایئے دل کو
ہم کو اتنا تو دل پہ ناز نہیں

جس کا جی چاہے نہ جائے — جس کا جی چاہے پی آئے
جام میں خود کو کھلتے دیکھا — نشہ مے نے رنگ جمائے
تجھ کو واعظ کیا کہ ہم سے — ہم کب تیرے آڑے آئے
پینے سے پہلے ہی بہکے — رند یہ مرتبہ کم ہی پائے
زاویے قوسیں سمتیں رنگ — لرزاں لرزاں مے کے سائے

○

ہیں طلسم امید سے زندہ
ورنہ ہم کب کے مر گئے ہوتے

بے وجہ در بدر نہیں ہیں ہم
گھر جو ہوتا تو گھر گئے ہوتے

موجہء مے سے گر بچے ہوتے
موج گل میں بکھر گئے ہوتے

سب کو دیر و حرم نے بانٹ لیا
راستے سب ادھر گئے ہوتے

جانے کب آ کے وہ گذر جائے
پھر سرِ رہگذر گئے ہوتے

○

تھی گفتگو بھی مگر آئیں بائیں شائیں رہی
وہ راستے میں ملا اور نظر بچا کے ملا

مجھے خبر ہے کہ دل میں لگی ہوئی تھی آگ
خیال راہ گذر تھا جو مسکرا کے ملا

نشہ تو ذہن کے اپنے سرور کا ہے نام
وہ بے پیے بھی ملا ہم سے رسمسا کے ملا

شبِ فراق میں وہ پوچھتا رہا ہم کو
ملا تو ہم سے مگر ہم کو آزما کے ملا

خیالِ تشنہ لبی رہ گیا تو کیا حاصل
یہ ہو کہ جام بھی ہم کو نظر ملا کے ملا

☆☆

تمہارا طرزِ تغافل ہی اختیار کریں
غمِ فراق و تمنائے یار کچھ بھی نہیں

○

جانے کیا شے ہے عکس آئینہ
نہ تصور ہے نہ حقیقت ہے

تجھ سے بچھڑے تو یہ ہوا معلوم
زندگی صرف ایک مصیبت ہے

آئینہ کے طلسم ٹوٹ گئے
اسکی انگڑائی اک قیامت ہے

زندہ ہیں اب بھی انکے حلقے میں
یہ بھی احباب کی مروت ہے

آئینہ کے مقابل آئینہ
عکس کو عکس کی ضرورت ہے

پیار سے سب گناہ دھلتے ہیں
پیار کرنا بڑی عبادت ہے

ہر لمحہ ساعتیں بدلتی ہیں
یہ تماشہ بھی اک حقیقت ہے

کوئی پل کوئی دم قرار نہیں
آدمی کیا ہے اک قیامت ہے

☆☆

جانے کب تم سے گلے ملے تھے
آنکھ ہماری اب بھی نم ہے
اے شیخ میری ضعیفی نہ دیکھ
پینے کو عمر اب بھی کم ہے

جانے کب سے لگائے ہوئے ہے وہ مجمع
مری وجہ سے تماشہ یہ بازی گر کا نہیں

رواں دواں ہے ہر اک رو حقیقتِ اجسام
صفائی ہاتھ کی یا کھیل یہ نظر کا نہیں

ہمارا زادِ سفر جانے کس نے باندھ دیا
ابھی ہمارا ارادہ کسی سفر کا نہیں

ہے عافیت کی کوئی تو جگہ غزالاں کو
جو حال دشت کا ہے اب وہ اپنے گھر کا نہیں

تمہاری بات زمانے سے مختلف ہے بہت
مزا جو غیض و غضب کا ہے درگذر کا نہیں

سوال یہ ہے کہ رہرو بنے تو کون بنے
سوال شہر نگاراں کی رہگذر کا نہیں

یہ کس نے روک لیا ہے جمال ماہ تمام
طلوع ماہ میں کچھ ذکر بام و در کا نہیں

میرے بچے
تیری آنکھوں میں ذہانت کی چمک
تیرے لہجہ میں نیا شوخی گفتار کا رنگ
تیرے الفاظ میں بیباکی اظہار کا رنگ
برق پا شعلہ صفت شورش افکار کا رنگ
یہ نئے عہد کا چہرہ ہے
ایک نیا دور جو حیرت کدہ علم کا دروازہ ہے
جس میں انساں کے اندر کا سفر سہل ہوا
تہہ بہ تہہ ذہن کھلا
جسم کے راز کھلے
حرفِ روشن کی طرح
سینۂ افلاک کھلا
جن میں پوشیدہ تھے سب لعل و گہر
کھل گئی ہیں وہ زمین کی پرتیں

عہدِ کمپیوٹر و ٹیکنالوجی
سمت اور وقت کی قدریں بدلیں

میرے بچے
یہ ترے لہجے میں
اعتماد اور اختیار کا رنگ

یہ اسی عہد کا عطیہ ہے

O

رندوں سے توقع نہ تھی آزردہ سخن کی
کیا کیجیے کہ بات ہے دنیا کے چلن کی

یا موسمِ گل آئے یا مے آئے یا تم آؤ
ویرانے میں پھیلی ہوئی خوشبو ہے چمن کی

نشتر کی زباں ہر رگِ جاں چاٹ رہی ہے
مخصوص تھی جو بات گئی دار و رسن کی

ہر زخم کے اندر بھی کئی زخم کھلے ہیں
کس درجہ سعی کیجیے آرائشِ تن کی

صندل ہے کہ کندن ہے کہ چندن ہے کہ لہریں
کس رنگ میں ہم بات کریں اسکے بدن کی

تین شعر

پھر عظمت انساں میں کیا باقی رہے گا
ڈرتا ہوں بہت حرف کی بے آبروئی سے

یکرنگی تو فطرت کی طبیعت ہی نہیں ہے
ہے گل کی نمو گل میں زرِگل کی دوئی سے

لوگوں کو شکایت ہے تو بیجا تو نہیں ہے
تم بات بھی کرتے ہو بہت ترش روئی سے

تین شعر

کجکلاہی کا بھرم ٹوٹ گیا میرے بعد
خاک ہے وقعت اربابِ جفا میرے بعد

رنگ لائی ہے گلستاں میں لہو کی تاثیر
گل کو مانوس ہوئی آب و ہوا میرے بعد

جانے کس طور نسیم سحری آئی ہے
جانے گلشن کا یہ کیا رنگ ہوا میرے بعد

○

اس ترکِ تعلق کا تعلق بھی عجب ہے
وہ یاد نہیں آیا تو ہم شعر نہ کہہ پائے

کمزور نہ تھے اتنے غمِ عشق سے پہلے
اک دکھ تھا تعجب ہے کہ ہم وہ بھی نہ سہہ پائے

ہر شخص یہاں دل میں لئے بیٹھا ہے اک بات
جو کہہ نہ سکے اور کہے بن بھی نہ رہ پائے

ہیں دل پہ مرے داغ جو قطرے ہیں لہو کے
سینہ پہ مرے جم گئے آنکھوں سے نہ بہہ پائے

احباب کی پرسش کا کچھ انداز عجب تھا
منہ دیکھ کے ہم رہ گئے کچھ منہ سے نہ کہہ پائے

☆☆

جانے کب سے خزاں کے عہد میں ہوں
یاد آئیں گی بہاریں کس کو

○

میرے پیتے ہی سر جام جگہ خالی ہوئی
ساقیا ٹھہر ذرا جام مرا بھرتا جا

راہِ تکمیل وفا مرحلۂ جاں میں ہے
اک مہم اور سہی اس کو بھی سر کرتا جا

یونہی ناکام نہ کہہ عشق کی یہ جدوجہد
کوئی الزام سرِ نامِ وفا دھرتا جا

سر مے خانہ رہے رسم بلا نوشی بھی
شیخ و واعظ سے بھی کچھ تھوڑا بہت ڈرتا جا

کسی مے خانہ پہ کیا ٹھہر کے کرنا ہے تجھے
رک کے ایک جام پی اور آگے سفر کرتا جا

☆☆

آپ سے اس لئے شکایت ہے
دوستو سے ہی گلہ ہوتا ہے

○

کیسی آسان بجھاتی ہے ہوا — کتنی مشکل سے جلاتے ہیں چراغ

خواہ دامن میں آگ لگ جائے — اپنے دامن سے بچاتے ہیں چراغ

راہیں سنسان جب ہو جاتی ہیں — پھر نجانے کہاں جاتے ہیں چراغ

ٹھیر جا اے ہوائے تند و تیز — ہم مقابل ابھی لاتے ہیں چراغ

راستے جب اندھیرے ہوتے ہیں — تو گھروں سے چلے آتے ہیں چراغ

روشنی سب کے لیے ہے لیکن — اپنی ہی لو میں سماتے ہیں چراغ

راستے کب سے چلے آتے ہیں — اور کب سے چلے آتے ہیں چراغ

تر کر کے جو آتے تھے گریباں کو لہو سے
اس دھج کے وہ رندانِ بلا نوش کہاں ہیں

بے منفعت خویش زباں ہی نہیں کھلتی
اور اس پہ یہ دعویٰ ھیکہ ہم اہل زباں ہیں

اے فصل جنوں تیرے وہ انداز کہاں ہیں
پھر دشت میں ہر سمت غزالاں نگراں ہیں

دیوانگی سے بار ہیں اپنے ہی تن پہ ہم
آواز دو کہ سنگِ سرِ راہ کہاں ہیں

☆☆

کتنا قریب لیکن عجب تعلق
آتا ہے بہت ہمیں دشمن یاد

بدن

کچھ اب کے بیاباں سے غزالاں بھی ہیں ناخوش
وہ شوخیِ خوباں ہے نہ وہ رنگ جنوں کا

کچھ زور نہیں چلتا گریباں پہ ہمارا
نشہ نہیں ہوتا ہمیں اب چشم فسوں کا

کیا اسکی شکایت کریں کیا خلق سے شکوہ
خود مجھ کو پتہ کب ہے مرے حال زبوں کا

چلیے سر صحرا چلیں اور خاک اچھالیں
لکھ جائیں فضاؤں میں کہیں نام جنوں کا

اس راہ سے گذرتے ہوئے اک بوند گری تھی
پھیلا ہوا صحرا پہ ہے دھبہ مرے خوں کا

☆☆

دل کو تو پکڑے رہتا ہے اک درد بے بسی
لائیں کہاں سے دوستو جینے کے حوصلے

○

جہاں جہاں بھی سفر میں نے اختیار کیا
وہیں پہ ٹھیر گیا تیرا انتظار کیا

بلندیوں کا سفر ابتدا کیا میں نے
زمیں سے رشتہ جاں پہلے استوار کیا

ترے بدن کے گلاب اورآبنوس کے رنگ
نظر نے دھوکہ کھا دل نے اعتبار کیا

صحیح ہو یا ہو غلط ہے یہ فیصلہ کہ دل
رہین جلوہ رنگ رخ نگار کیا

☆☆

آستاں ہم کو نہ ملا تیرا
ہم نے ہر در پہ جبہ سائی کی
خود کو الزام دے رہا ہے دل
بات کرتا نہیں ہرجائی کی

○

تسخیر کی منتظر ہے فطرت   ہم قانع ہیں زندگی پہ
ہر گام ذلیل ہو رہا ہوں   لعنت ہے ایسی بندگی پہ
کرتا ہے ناخدا، خدائی   ہم بار ہیں اپنی زندگی پہ
جینا سیکھا ہے ہم نے ان سے   سب وقت پڑے ہیں آدمی پہ
ہو نہ کہیں راہزن کا ڈیرا   کیا اعتبار روشنی پہ

غم آوارگی سے ملتی ہے
وسعتِ قلب بے نیازئ جاں

جرسِ گل کی صدا آتی ہے
قافلہ نو بہار کا ہے رواں

اس خرابے میں کیا سفر کیجیے
جس کی وسعت ہو کلِ حدِ امکاں

تجھ سے وابستہ ہے نشاطِ دل
جس طرح موج پہ سایہ رقصاں

اس قدر تیز ہوا ہے باہر
لے کر جائیں کہاں دلِ لرزاں

جیسے سبزہ پہ صبا چلتی ہے
اس کا کندن سا بدن ہے رقصاں

یہ گرد سفر نہیں سفر ہے — زیست خود اپنی راہبر ہے
ہم چھوڑ جائیں اس گلی میں — افسردہ سی بس اک نظر ہے
یونہی تو نہیں چھپا ہوا ہے — ہم ڈھونڈتے ہیں اسے خبر ہے
اس میں بھی چراغ جل رہا ہے — وہ دور بہت جو ایک گھر ہے
کیا جنسِ وفا یہاں نہیں ہے — لوگو یہ کون سا نگر ہے
رنگیں جمالِ چہرہ وہ ہے — اور رقص کناں مری نظر ہے
کتنا زاد راہ اٹھائیں — جو ختم نہ ہوگا وہ سفر ہے

○

بیکار ہیں سب رسل و رسائل کے طریقے
وہ اتنا خفا ہے کہ مجھے خط نہیں لکھتا

اس شہر کے اس کوچہ میں رہنے کی ہوس ہے
اور ہیں وہ شب و روز قدم ہی نہیں ٹکتا

ان ہونٹوں کی سرخی کی کشش لائیں کہاں سے
اس شہر میں تو رنگِ بہاراں نہیں بکتا

وہ چشم و لب وہ یار وہ مہکار بدن کی
سیلاب ہے یادوں کا جو روکے نہیں رکتا

احباب بھی کہتے ہیں کہ اب اس کو بھلا دو
ہے بات تو یہ ٹھیک مگر دل نہیں ٹھکتا

☆☆

ایک میں ہی نہیں سبھی چپ ہیں
جیسے ہو ساری انجمن تنہا

○

بیچ سے لوگوں کا اک ریلا گیا — پھر بہت ڈھونڈا اسے، وہ نہ ملا

اس نے دیکھا اور نگاہیں جھک گئیں — میں نے دیکھا اور میں چپ رہ گیا

اس سے نہ ملنے کی کھائی ہے قسم — وار کاری تھا مگر میں سہہ گیا

تیرے بالوں میں لگایا تھا جو پھول — باغ سارے ڈھونڈے ویسا نہ ملا

میرا کمرہ کنج گلشن راستے — تیری یادوں سے ہر ایک بھیگا ملا

○

مے کدہ میں جگہ نہیں نہ سہی بیٹھ کے رہ گذر پہ پی لیں گے
اتنا کم ظرف بھی ہمیں مت جان کوئی دن بن پیئے بھی جی لیں گے
سینہ زخم سے ہے قدرِ عشق عشق نہ ہو تو زخم سی لیں گے
ان جفاؤں کے ہوگئے عادی چوٹ دل پہ کوئی نئی لیں گے
اپنے غم کی جو پذیرائی کی خلق کا درد بھی یوں ہی لیں گے

○

یوں بھی ہوتا ہے کہ ملنے سے سوا ہوتا ہے
ڈھونڈنے میں اسے ایک اور مزہ ہوتا ہے

اپنا دکھ اہل چمن خود ہی سہا کرتے ہیں
شہر میں کس کو غم باد صبا ہوتا ہے

فطرت رنداں ہے ہنگامہ فزا کہ ہر آن
سر میخانہ نیا حشر بپا ہوتا ہے

ڈوبنے والے کو اس علم سے کیا فائدہ ہے
ناخدا ہوتا ہے یا جانے خدا ہوتا ہے

بے وفائی کا کوئی شوق نہیں تھا ہم کو
بس جو ہوتا ہے زمانے میں برا ہوتا ہے

اک مروت کی محبت کی فضا بنتی ہے
جو بھلا کرتا ہے اس کا بھی بھلا ہوتا ہے

○

تمہارے شہر کا سناٹا بھی عجب دیکھا
جو بولتا ہے اسی کی صدا نہیں آتی

کسی کی چپ سے ترا شہر گونج اٹھتا ہے
کسی کے ٹوٹنے کی بھی صدا نہیں آتی

نہ مہربانی واعظ نہ محتسب کا کرم
غریبِ شہر کو رسمِ دعا نہیں آتی

میں لاکھ چپ رہوں رہزن کو یہ یقین رہا
کہ مجھ کو دستِ جفا سے وفا نہیں آتی

خبر نہیں ہے یہ شب کے نگہبانوں کو
سفیرِ صبح کی آوازِ پا نہیں آتی

ہجومِ رنداں ہے واعظ سنے گا کون تمہیں
جب آندھی چلتی ہے آوازِ پا نہیں آتی

○

مجمعِ سنگ گرداں
ہر اک راہ میں
اور قبائے لہو
پھر گرانبار ہے درد کا پیرہن
خارزاروں کی فصلیں بدن در بدن
خاک کے قرض میں چشمِ ویراں رہن
مے کی کلکاریوں کی جگہ اب ہوا
ایک سازِ سلاسل کی آواز ہے
پھر درِ زنداں پہ ختم ہوتے ہوئے
راستے کوئے دلدار کے
پھر نگاہ رہ آوارہ انبوہ میں
بند کرتے ہوئے
کوچہ کوچہ مکینوں کے در
بے خطا چن گئے پھر سے دیوارِ زنداں میں ہم
زندگی جلتی تصویر ہے
داغ سہمے ہوئے
سوختہ جنگلوں کی طرح

کل بھی تھے
اب بھی ہیں
خشک تڑخی زمین کی طرح سے
دریدہ بدن
کل بھی تھا
اب بھی ہے
راہزن بھی وہی دست بیباک بھی
کل بھی تھے
اب بھی ہیں
ایک کل وہ جو تیرہ نومبر کو تھی
کل بھی تھی
اب بھی ہے
وقت کی تیز بوچھار تھم سی گئی
شاہراہوں پہ رفتار جم سی گئی
دوستو
تابہ کہ
شاہراہیں ترستی ہیں آواز کو
وقت شرمندہ ہے اپنی رفتار سے

آؤ پائے فگاراں ہی لے کر چلیں
گل نہیں نہ سہی خار داماں تو ہیں
دامنِ دل میں کچھ بھی نہیں نہ سہی
سنگ کوئے نگاراں ہی لے کر چلیں
دست افشاں سہی پا بجولاں سہی
کوئی تازہ علم
آج کے دن کو پھر سے لہو کر چلیں

10-10-85

○

کس طرح تارِ دامانِ شب
سینہ چاکِ سحر کا رفو کر سکے
کیسے سجدے
غلامانِ سرکار کے
ان کی تیرہ جبینوں سے فردِ عمل دھو سکیں
کس طرح دستِ گلچیں سے امید ہو
تختۂ لالہ و گل کو روشن کرے
فکرِ بے مائیگی ذہن بے چارگی
ایک کشکولِ سرمایۂ زندگی
جن کے ہاتھوں پہ ہے ہر سحر کا لہو
ان سے امیدِ صبح پذیرائی کیا
جن کو ہے جستجو کنجِ مہکار
تا کہ بوئے وفائے غلامی دے
جن کو ہے جستجو رنگِ گلزار کی
تا کہ سرخی خونِ شہیداں چھپے

جن کے نقشِ کفِ پا سے ہر دور میں
ہم پہ زنداں کے در کوئے قاتل کی راہیں کھلیں
ان سے امیدِ صبحِ طرب کیا ملے
جن کے دل شامِ غم سے بھی تاریک ہیں

28-12-85

تین شعر

اے کشتگان جراتِ اظہار دیکھنا
ہم نے صلیبِ حرف سرِ راہ سجا دی

رسم جنوں کی شوخ نگاہی کے واسطے
ہم نے تمازتِ لب و رخسار گنوا دی

نیزوں کو ترازو کیا خود اپنے جگر میں
اور رقص کیا اپنا لہو اپنی نظر میں

تین شعر

لذت درد رزق جاں ٹھہری
زخم منت کش رفو نہ ہوا

اسکے کوچہ سے آگے دنیا تھی
سر کو سودائے جستجو نہ ہوا

اشک ٹھہریں تو چشم تر ٹھہرے
دل کبھی ایسے تو لوہو نہ ہوا

○

فاصلہ ہی کتنا تھا میکدے سے کوئے یار
راستے میں آگئی منزلِ فرازِ دار

ہم ہوں اور سرمستی ' دل ہو اور سرشاری
چاندنی ہو اور ہوا' میں ہوں اور روئے یار

اب کے سال بھی بادل جانے کیوں نہیں برسے
فصل بے ثمر اٹھی بے نمو رہے اشجار

واعظوں سے کیا جھگڑا محتسب سے کیا خدشہ
جیب ہے تہی داماں سر ہے مستیوں سے زار

29-10-85

☆☆

مشکل تھا ان کو دشنہ وناوک میں انتخاب
اور ہم دل پر خوں کا ہنر دیکھ رہے تھے
آزردگی شام ہمیں کھانے لگی تھی
افسردگی رنگ و سحر دیکھ رہے تھے

○

شیخ کی نوازش ہے اور ہم تہی داماں
آپ کی عنایت ہے اور یہ دل نادار

دامن و گریباں کا پاک ہو گیا قصہ
کھل کے رقص کیجیے اب کیسا دشت کیا بازار

ہجر راس آجائے منتِ صبا کیسی
زخم کھلنے لگتے ہیں جب ہوں صبح کے آثار

پتھروں سے پتھر کو سنگسار کرتے ہیں
دل میں کیا چبھیں کانٹے واں تو ہے ہجومِ خار

☆☆

میرا سفر زنداں در زنداں
اور اسے آزادی کہیے
خاک جلے خیموں کی لے کر
اس کو بھی آبادی کہیے

○

دلداری دست قاتل میں کیا فکر کریں جان و تن کی
اک زخم رفو ہو جاتا ہے سو زخم نئے کھل جاتے ہیں

یہ موسم گل کا شور نہیں یہ باد صبا کی چاپ نہیں
سر گشتہ ہوئے ہیں زندانی یا پہرے بدلے جاتے ہیں

جب دل پہ غم کا بوجھ پڑے جب سامنے کوئے جاناں ہو
جب اپنا گریباں ہاتھ میں ہو کب وحشی قابو آتے ہیں

ہے سر پر مشت خاک جنوں سینے میں چراغ درد کے لو
لو ہم نے صحرا بانٹ دیا لو درد لٹانے آتے ہیں

کچھ ہجر کی شب کی پیاس رہی کچھ خاک کیا ہے دنیا نے
آنکھوں سے نیند اڑی جیسے صحرا سے بادل جاتے ہیں

اک شہر سے اپنی یاری تھی جب دل کی وحشت بھی کم تھی
پہچانے تو اب بھی جاتے ہیں ہاں دیوانے کہلاتے ہیں

برکھا کی مسیحائی کا اثر ہم نے بھی سنا تو ہے اکثر
زخموں پر دیکھیں کیا بیتے پودے تو ہرے ہو جاتے ہیں

○

واۓ ساحل نے کیا کہا کہ موج
اپنے سر کو پٹکتی جاتی ہے
ساعتِ دید آ نہیں پاتی
اور یہ عمر گھٹتی جاتی ہے
راہ دشتِ وفا طویل سہی
چلتے چلیے کہ کٹتی جاتی ہے

○

ساتھیو دوستو
اپنے پرچم تلے
عزمِ منزل لیے
آگے بڑھتے چلو
آج اترے ہیں میداں میں ہم
جیتنے کے لیے
آگے بڑھتے رہینگے ہمارے قدم
ساتھیو
آج ہے امتحان
دست و بازو کے فولاد کا
ظلم مٹ جائیگا
جھوٹ مر جائیگا
ہر تعصب کی دیوار گر جائیگی
اپنے ہاتھوں میں ہے
اک نئی زندگی
اپنے قدموں تلے
اک نیا راستہ
ساتھیو دوستو

8-1-86

ہلکا سفر ہو باد صبح نو بہار کا
ہم نے خزاں کا بوجھ دلوں پر اٹھا لیا

تسکین اضطراب نہ صحرا نہ گھر نہ بار
ہم نے مقابل عشق کے سب آزما لیا

اک جھوٹ ہے تغافل اور اک جھوٹ ترک عشق
ہم نے تمھیں اور تم نے ہمیں آزما لیا

بازار کو تلاش تھی اک ارزاں جنس کی
رقصِ جنوں کو ہم نے تماشا بنا لیا

اک کم سے کم معیار کا قانون لکھ دیا
ہم نے صلیبِ عشق پہ خود کو سجا لیا

اہلِ گلشن نے کی اس گل کی پذیرائی بہت
جس کی خوشبو سے گئی فصل کی یاد آئی بہت

دیکھیں آواز دیں شاید کوئی پہچانے ہمیں
پہلے اس شہر میں تھی اپنی شناسائی بہت

سوختہ کنج روش خاک قلم شاخِ گل
نقش ہر سمت ہے اک شخص کی رسوائی بہت

یوں تو پایاب ہے پر اس میں قدم تو رکھو
موج تنہا میں سمندر کی ہے گہرائی بہت

☆☆

کچھ وفاؤں کا صلہ بھی ہمیں ظالم دیدے
ظلم سہنے سے کب انکار کیا ہے ہم نے
ہیں تری چشم فسوں ساز کے آگے سب ہیچ
جانے کس زہر کا یہ جام پیا ہے ہم نے

تین شعر

میرا حق ہے کہ وہ روٹھے تو منالوں اس کو
اس کا حق ہے اسے سینہ سے لگایا جائے

پھر تری یاد کی لو ہونے لگی ہے مدھم
پھر کوئی داغ سرِ بزم جلایا جائے

وہ جو دھندلا نہ سکے میری محبت کی طرح
کینوس پہ کوئی نقش ایسا بنایا جائے

☆☆

پیروں کے آبلے ہوں یا سینے کے زخم ہوں
ان میں ہی اب تو ملتا ہے آرام گھومنا

O

دل کی کسی محفل میں پذیرائی نہیں ہے
لوگوں میں ابھی رسمِ شناسائی نہیں ہے

سورج تو طلوع ہوتا ہے ہر صبح کو لیکن
جس شہر میں ہم ہیں وہاں بینائی نہیں ہے

ہرجائی گر ہوتا اسے دل رکھنا تو آتا
ہم پر یہ جفا ہے کہ وہ ہرجائی نہیں ہے

☆☆

امید وصل و ساعت دیدار دور ہے
لیکن کسی سے مژدہ اقرار تو ملا
تنہائیوں کا کرب بڑا جانگداز تھا
مدت کے بعد ہی سہی غم خوار تو ملا

○

تری یاد ہے چراغاں ترا تذکرہ بہاراں
کہیں اشک ہیں فروزاں کہیں زخم گلعذاراں

وہی ابر و بار و موسم وہی شام شہر یاراں
وہی رہن مے دل و جاں وہی رنگ دوستداراں

بڑا قرض تشنگی ہے بڑا قرض ہا و ہو ہے
در میکدہ کھلے تو سجے بزم میگساراں

نہ وعید وصل کوئی نہ ہی نقد عہد الفت
یونہی قرض جاں لٹا دی سر کوچہ نگاراں

چلو پھر سے جمع کر لیں کہ متاع بے بہا تھی
وہ نوائے دردمنداں وہ سروش جاںنثاراں

○

پھر اب کے آیا نہیں دل کا قافلہ کوئی
فسردہ سبزہ و گل ہیں صبا اداس رہی

تمام شب رہے ہم میکدہ میں جام بدست
تمام شب ہمیں ساقی کی کتنی آس رہی

شبِ فراق رفیقوں نے ساتھ چھوڑ دیا
بس اک نگاہ تری دل کے آس پاس رہی

یہ اور بات گزارا کیے خوش و ناخوش
یہ عمر کب ہمیں تیرے بغیر راس رہی

متاع رائیگاں ٹھیرا لہو مگر یہ ہوا
زمین کوئے ستم وقف صد سپاس رہی

○

میں دار و رسن کو چومتا ہوں
یہ ہم شہیدوں کی آشنا ہے
آئے جسے عشق ہے وطن کا
یہ عشقِ وطن کی رہنما ہے
یہ تختہ دار نہیں ہے یارو
میں سحر کی دہلیز پہ کھڑا ہوں
تاریخ فیصلہ دے رہی ہے
قاتل بڑا ہے کہ میں بڑا ہوں
لوگو تمہارے دکھ کے ناتے
میں اپنے خواب لکھ رہا ہوں
قاتل کی تیغ چل رہی ہے
میں انقلاب لکھ رہا ہوں
مرنے کے لئے تو میں چلا ہوں
کیوں کپکپا رہا ہے فرعون
سنگینیں ہیں انکی میری جانب
اور لرزا کھا رہا ہے فرعون

پھانسی پہ مرا جسم جھولتا ہے
کوئی مجھے قتل کر نہ پایا
میں زندہ واپس آ گیا ہوں
لوگو مرے قبیلے والو
سہمے ہوئے بازو کھول ڈالو
پلکوں کے جھکے نیزے اٹھا لو
جو نعرہ تختہ دار سے سنا ہے
جس نعرے سے قاتل دہل گیا
وہ نعرہ جواب چاہتا ہے
شیروں کی طرح سے بڑھتے آؤ
طوفاں کی طرح جواب لاؤ

○

تیری طرف نہ گزرنا تھا اور جا نکلا
یہ راستہ بھی مرا درد آشنا نکلا

امید و دید کے بے نام قافلوں کی جگہ
سفر پہ چہرہ گردِ سفر تنہا نکلا

وہ یاد شعلہ رخ تھی جسے بجھانے کو
میں جب چلا تو الاؤ کی سمت جا نکلا

نہ کوئی یاد تری یاد کو بھلا پائی
نہ کوئی درد ترے درد سے سوا نکلا

وہ گم ہوا تو کچھ ایسا کہ مجھ کو بھول گیا
میں خود کو کھو کے اسے اور ڈھونڈتا نکلا

○

دل کی وحشت سے عجب کام لیا ہے ہم نے
سر مقتل بھی ترا نام لیا ہے ہم نے

عالم مستی میں رندوں نے جھجک کر چھوڑا
ہوش میں زہر کا وہ جام لیا ہے ہم نے

یہ کڑی دھوپ تو قیمت ہے اس ایک لمحہ کی
جب تری چھاؤں میں آرام لیا ہے ہم نے

زیست شرمندہ ہنسی کی طرح منظور نہیں
عشق کا عرصہِ آلام لیا ہے ہم نے

جہد تکمیل کا ایک رنگ ہر اک ذات میں ہے
ہوس عشق سے بھی کام لیا ہے ہم نے

20-1-84

○

رستے کے دونوں جانب
پھول کھلے ہیں
اودے گلابی اور عنابی
نیلے پیلے سرخ سفید
ہوا کے جھونکے سے لہراتے
پھولوں میں سب منظر ایسے سمٹ گیا ہے
جیسے کسی بچے کی ہنسی
دنیا کا موسم
اپنے حق میں کر لیتی ہے

○

راہ گذر پہ بچھی ہوئی آوازوں سے
کہتی ہوئی گزری ہے ہوا
اٹھو کہ سب آوازوں کو
طوفان کا بلاوا آیا ہے

○

فکر بے نوا ٹھیری حرف بے صدا ٹھیرے
دیکھیں اب کے موسم میں دل کی کیا سزا ٹھیرے

کیا گلہ ہو رہزن کا راستوں کا کیا شکوہ
قافلہ ہے واماندہ آپ رہنما ٹھیرے

ساتھ چلنے والوں پھر سوچ لو یہاں سے اب
زخم کا سفر ہے یہ، زخم آشنا ٹھیرے

اب شکستگی دل کی رنگ لانے والی ہے
دیکھیں اے شکستِ شب صبح ہو تو کیا ٹھیرے

وحشتوں کی بستی میں کس سے ہم اماں مانگیں
قاتلوں کا سایہ ہے لوگ جس جگہ ٹھیرے

○

تمام رات جسے جاگ کر لکھا میں نے
وہ چند سطروں کا خط تجھ کو بھیج بھی نہ سکا

کچل نہ دے کہیں تم کو یہ راستوں کا ہجوم
نہ چھوڑ دے تمہیں پیچھے یہ کاروانِ ہوا

میں سوچتا ہوں یہ کس کا دیار ہے جس میں
ہوا میں جلنے کی بو پانیوں میں زہر گھلا

14-4-81

☆☆

ترے ستائے ہوئے لوگ بات بھی نہ کریں
جواز یہ بھی ہے اک تری برہمی کے لئے
تمہاری بزم میں خاموش رہ بھی جائیں اگر
تراشو گے نئے حیلے ستم گری کے لئے

○

یہ سوچ کر ستم ترے ہم لوگ سہہ سکے
تجھ سے کوئی تعلق خاطر تو رہ سکے

یہ بزم ہے کہ جنبشِ لب بھی محال ہے
اک تیری آرزو تھی سو وہ بھی نہ کہہ سکے

نکلا تھا کائنات میں اپنی تلاش میں
پھر دسترس سے دور خدا بھی نہ رہ سکے

☆☆

گلہ کریں تو وفاؤں پہ حرف آتا ہے
جو چپ رہیں تو تعلق ہی ٹوٹ جاتا ہے
سمندروں نے یہ توہین کیوں گوارا کی
جسے تھا ڈوب کے مرنا وہ بچ کے آتا ہے

مدتوں بعد
یہ اک حرف تسلی مرا مقسوم بنا
پرسشِ درد کا موسم آیا
یوں سرافراز ہوئی دیدہ تر کی شبنم
کھل گیا قافلۂ دل زدگاں کا پرچم
کم ہوئی آنکھوں کی بے خواب جلن
پر یونہی کم نہ ہوئی
کتنی جلتی ہوئی راتوں کے سلگتے لمحے
نذر کرتے رہے ہم
دیدہ بینا کے انمول جواہر کھوئے
تب کہیں حدِ نظر پر ہو ادا
منظرِ دشت تمنائے وصال
سرخیِ عشق ستم کیش رہے ہیں برسوں
تب یہ اک لمحہ مرا حرف تسلی ٹھیرا
آج یہ حرف فقط حرف تسلی ہی سہی
کل کسی درد کا درماں ہوگا

آج مدہم ہے بہت نقشِ بہاراں کی روش
کل یہی نقش حنا بندِ نگاراں ہوگا
غنچے لب بستہ سہی
شوخیِ بادِ صبا بڑھنے دو
نہ سہی بندِ قبا وا نہ سہی
جراتِ دستِ رسا بڑھنے دو

20-1-89

نہ چارہ گر ہے نہ ناصح نہ اب رقیب کوئی
تمہارے نام سے تھیں آشنائیاں کیا کیا

غرورِ عہد وفا، زعم کج کلاہی کا
تھیں ہم پہ زیب کبھی خود نمائیاں کیا کیا

ہمارے ساتھ رہیں کتنی چاہتیں تیری
ہمارے نام پہ تھیں کج ادائیاں کیا کیا

وہ ایک بات کہ دیوار و در بھی دشمن تھے
وہ بات دل میں ہمارے سمائیاں کیا کیا

☆☆

اس کی جانب اشارہ بھی نہ کیا
ذکر کرتے تھے اپنے حال کا ہم
جام چٹخا تھی کس کے دل کی کھوٹ
سمت و رخ دیکھتے تھے بال کا ہم

حسن نہ ہو تو کائنات فضول
گر حسیں نہ ہو زندگی بیکار

عشق میں خود سے جنگ ہوتی ہے
گردشِ عشق کا ہے اپنا مدار

اک تماشہ ہے خشکیٔ لب کا
چشم نم جام مے و ابر بہار

آپ کا چہرہ دیکھ کر جانا
کیسے ہوتے ہیں سادہ و پرکار

اک شعلہ ادھر سے گذرا تھا
کر گیا میکدہ کو آتش بار

بندگی ہے کہ شرمساری ہے
اے خداوند قاہر و جبار

تجھ سے تیرا گلہ کیا کیجیے
ناتوانی ہے اور اتنا بار

26-11-95

آخری موڑ پہ زندگی کے
سوچتا ہوں دل رنجیدہ لئے
وہ جنہیں میں نے سفر سونپا ہے
بڑی تکلیف میں ہیں بڑے آزار میں ہیں
کوئی مقصد ہے نہ منزل نہ فریضہ کوئی
جیسے صحرا میں کہیں کانٹوں کی خودرو جھاڑی
اپنے ہی آپ کو چبھنے کے لیے اگتی ہے
کوئی انصاف نہیں عزت و توقیر نہیں
کہیں مبہم سی امیدوں کی بھی تعبیر نہیں
لطف و ہجر و وصال ان کا نہیں
ماہتاب جمال ان کا نہیں
بے صدا دستکیں دینے سے حاصل کیا ہے
میں جو نکلا تھا تو معلوم نہ تھا
کسی رہزن کا میں کھویا ہوا سرمایہ ہوں
کسی مقتل کا یرغمالی ہوں
خود بھی میں قید رہا قتل ہوا
جاتے جاتے
دل رنجور کے ٹکڑے اپنے
دستِ قاتل کے لیے رہن کئے جاتا ہوں

5-4-96

عزم منزل ہی تھا راہِ منزل نہ تھی
مڑ گیا جس طرف راستہ مڑ گئے

ایسے دہشت زدہ ہیں گھٹاؤں سے اب
جس طرف منہ اٹھا ناخدا مڑ گئے

دیکھنا کہ طلوعِ سحر کی طرف
محفل شب کے سب آشنا مڑ گئے

رونق عشق اہلِ حرم میں کہاں
سوئے بت خانہ اہلِ صفا مڑ گئے

جس طرف بادِ صرصر لپکتی رہی
اس طرف مرغِ قبلہ نما مڑ گئے

کیا فکر ہماری کہ سدا غرق لہو میں
ہاں اہل حکم رونق دربار سلامت

زنجیر سے ثابت ہے گنہ گار ہیں ہم لوگ
ہاں تیغ بکف عدل شہریار سلامت

کیا نان جویں جان کی ہی خیر نہیں ہے
اس شہر میں ہنگامہ بازار سلامت

نہ پرسش احباب نہ رنجش ہے عدو کی
افسردگی عشق کے آثار سلامت

اس ہجوم خاکساراں میں بہت سے لوگ ہیں
جن سے مل کر آسماں کی رفعتیں نیچی لگیں

کتنے اندیکھے ستارے ٹوٹ کر گرتے رہے
بے چھوئے بھی اسکی پلکیں ہاتھ کو بھیگی لگیں

خلق کس کے نام لکھے اپنی مجبوری کا جرم
آپکی تو ساری باتیں بے گناہی کی لگیں

☆☆

تاریکی جب شب خون مارنے آتی ہے
سورج کی مانند طلوع ہوتے ہیں لوگ

○

ہے گھومنے کا لطف کہ بیکار گھومئے
صحرا کو دیکھیے کبھی بازار گھومئے

ایک بار آپ اپنی بھی قیمت لگایئے
بن کر کے آپ اپنے خریدار گھومئے

اس شوخ کے طلسم سے باہر نہ جایئے
خوابیدہ گھومئے کبھی بیدار گھومئے

آوارگی کے سارے طریقے نبھایئے
دل میں لئے نشاطِ غم یار گھومئے

یہ رائیگاں سفر ہے کہیں بھی تمام ہو
مسجد کہ مدرسہ کہ درِ یار گھومئے

نہ قافلہ نہ طبل و علم ہے نہ راہِ عشق
اڑتی ہے خاک کوچہ و بازار گھومئے

○

مجھ کو معلوم نہ تھا
مجھ کو خبر ہی نہیں تھی
کہ مرے دل کے تئیں
ایک گوشہ میں کہیں

ایک چہرہ ہے
کبھی کھلتا ہے مہتاب کی کرنوں کی طرح
اور چھپتا ہے کبھی روزنِ در کی مانند
ایک گوشہ میں فروزاں ہے یہیں
ایک عکس اترا کہیں آنکھوں سے
دل کے گوشہ میں کہیں بیٹھ گیا
تیر پیوست ہوا دل میں کہیں ٹوٹ گیا

مجھ کو معلوم نہ تھا مجھ کو خبر ہی نہیں تھی
ایک چہرہ ہے جو کہ دل کے کسی گوشہ میں
ایک الاؤ سا جلا رکھتا ہے
دل کبھی آتشِ سوزاں کی طرح
کبھی اس دھوپ کی مانند کہ جھلس جائے نظر
شمع کے شعلے کی طرح
ہاتھ رکھے ہوئے ہوں میں جس پر
ایک جلن ایسی جلن

جسکی لذت میں نہا جاتا ہوں

مجھ کو معلوم نہ تھا
مجھ کو خبر ہی نہیں تھی
ایک چہرہ کہ جو بارش کے خنک قطروں میں
دل پہ ٹپکا تا رہا ہر لمحہ امرت اپنا
بادِ صبا کی مانند
لہلہاتے ہوئے سبزہ کی طراوت کی طرح
جیسے ایک آبِ رواں
شبستان کی طرح موجہ گل کی مانند
ابرِ بہاری کی طرح
آس دیتا رہا
مسکراتا رہا

ایک چہرہ جو میرے ساتھ رہا
مجھ کو خبر ہی نہیں تھی
گھل گیا تھا مرے احساس میں
ایسے کہ مجھے اس کا احساس نہ تھا
میرے ہر لمحے دلگیری میں
وہ میری آس رہا
سرخوشی کی ہر ایک ساعت میں
وہ میرے پاس رہا

میرے سینے میں رہا
لذتِ زخم جگر کے مانند
میری آنکھوں میں رہا
میری نظر کی مانند

ایک دن روٹھ گیا مجھ سے
تو احساس ہوا
آج پہلے پہل اس دل پہ خزاں آئی
سینہ زخم کے ہاتھوں دل کی
پہلی ساعت ہے کہ رسوائی ہے
میں جو چاہوں کہ منا لوں تو منائے نہ بنے

ایک چہرہ
جس کو ایک بار ہی دیکھا تھا کہیں
اور جب سے
دل کے ایک گوشہ میں ٹھیرا ہے وہ ایسے کہ مجھے
ایک ہی خواہش ہے
آخری بار میں جب بات کروں
اسکے ہی گوشہ لب سے آئے
آخری سانس مری
اسی گوشہ سے چلے
اور وہیں رک جائے

28-10-95

○

چراغِ راہگذر برگِ زرد خاکِ چمن
ہوائے تند کے ذمہ حساب کتنے ہیں

نگہ و ساغر و آبِ رواں کہ روئے گل
اس ایک رخ سے یہاں ماہتاب کتنے ہیں

شمار اشک نہیں ہے حسابِ داغ نہیں
سوال ایک لہو کا' جواب کتنے ہیں

جھکی ہوئی رہیں پلکیں تو شام اترتی ہے
نگاہ اٹھاؤ تو یہ آفتاب کتنے ہیں

لہو رگوں میں نہ آنکھوں میں اشک ہیں رضوی
کوئی بتاؤ کہ باقی عذاب کتنے ہیں

28-2-96

○

اپنے ہونے کے سزا پائی ہے ہم نے ایسی
اپنے نہ ہونے کا احساس بھلا لگتا ہے

راہیں خونناب در وبام و دریچے ہیں لہو
اب کے مقتل کا کچھ انداز نیا لگتا ہے

تجھ سے ملنے کے بہانے تو بہت تھے لیکن
تجھ سے نہ ملنا کئی بار بھلا لگتا ہے

جو بھی آیا ہے تیری بزم میں ہم جیسا ہے
دل زدہ کوئی کوئی آبلہ پا لگتا ہے

☆☆

جہاں آزادئ میخانۂ ہو منت کشِ زنداں
تلاش شوخی رفتار مے واں زہر میں کر لیں
یہاں پر کاروبار درد ویرانی فزوں تر ہے
غریب صحرا سے کہیے وطن اب شہر میں کر لیں

کسے تھی فرصت آوارگیٔ فکر و خیال
جنوں نہ ہوتا تو کیوں تیری آرزو کرتے

نہ اتنا اذن کہ در سے ہی تیرے لوٹ آتے
نہ کوئی حرف شناسا کہ گفتگو کرتے

کہیں نشاں مرے بال و پر کے مل جاتے
قفس کی سمت اگر آپ جستجو کرتے

نمازِ عشق سلامت ' جو مے نہیں ہے تو کیا
لہو سے اپنے سرِ میکدہ وضو کرتے

تمہارا شغل تماشائے اشک افشانی
ہمارا کام یہی تھا کہ دل لہو کرتے

یہ سلسلہ ہی جفا و وفا کا ختم نہیں
خبر یہ ہوتی تو کچھ اور آرزو کرتے

ہمارے عشق کے دعووں کو بے وقعت نہ سمجھ
کہ عمر گزری ہمیں پاس آبرو کرتے

بچائے رکھا اک عالم کی شرمساری سے
اگر یہ ہوتا کہ ہم دل کو روبرو کرتے

☆☆

کل کے انسان کے امکان میں ہے
مرتے سورج کو زندگی دینا

کہکشاؤں کا بھی دھیان رہے
اور دلوں کو بھی روشنی دینا

میں نے سر کر لیے ہیں تازہ افق
آرزو اب کوئی نئی دینا

○

ایک چنگاری کی ہستی ہی بھلا کیا لیکن
شہر جل اٹھتا ہے جب تیز ہوا آتی ہے

کس نے دشوار بنا دی ہیں وہاں کی راہیں
صحنِ گلشن سے ہوا آبلہ پا آتی ہے

یوں تو سناٹا سا ہر سمت بپا رہتا ہے
جب کوئی شہر میں ہوتا ہے صدا آتی ہے

آپ کے دستِ حنائی کی قسم کھاتے ہیں
دل کے زخموں کو فقط ایک دعا آتی ہے

پوچھنے والو کا کیا وہ تو یونہی پوچھتے ہیں
ہم کو مشکل سے کوئی بات بنا آتی ہے

شہر سے آتی ہوئی دشت سے آئے رضوی
تار دامن لئے ہاتھوں میں صبا آتی ہے

تین شعر

ہم وفا کرنے پہ ایسے کوئی مجبور نہیں
جبر تو عشق میں بھی ہو ہمیں منظور نہیں

انقلابات نئی صدیوں کے آنے والے
دور نظروں سے تو ہیں دل سے مگر دور نہیں

عمر ہر دور میں خواہش کی حدیں رکھتی ہے
وہ تو اک کارِ ہوس ہے کہ جو محصور نہیں

☆☆

ہم دستِ حنائی کے قصے پھرتے تھے لئے بازاروں میں
سب جھگڑے شیخ و واعظ کے مے خانہ میں نبٹاتے تھے

☆☆

تمہارے حسن کا ثانی نہیں ہے
کوئی ہم سا ہوا رنگیں نوا کیا

○

لامکاں نام ہے اس زنداں کا
عشق احاطہ ہے حد امکاں کا

شیخ ناصح رقیب کوئی رہے
شہر کہلائے گا نگاراں کا

مدتیں ہوگئیں ملے اس سے
پھر کوئی تذکرہ بہاراں کا

کوئے قاتل میں سب ہی اپنے ہیں
نام رکھ لیجیے کچھ بھی یاراں کا

ہائے وہ خوبرو بھی ہوتا اگر
کیسا موسم ہے ابرو باراں کا

راہیں سب اسکے در پہ ملتی ہیں
اک طلسم ہے یہ رہگذاراں کا

بڑھ گئی ہیں اداسیاں رضوی
پھر سفر کیجئے کوئے جاناں کا

○

آذر کو بت عزیز ہے ہم کو خدا عزیز
تخلیق کا ہر اک کو اپنا نشہ عزیز

یکطرفگی عشق کا انداز دیکھیے
جس کو وفا عزیز ہو اسے بے وفا عزیز

کیا شکوہ بے رخی کا غرور التفات کا
غمزہ عزیز عشوہ و ناز و ادا عزیز

خوشبو کبھی تو لائے گی اسکی صبا تو ہے
آئے کسی بھی رنگ میں ہم کو صبا عزیز

گر مل گیا تو اس سے زیادہ عزیز کیا
گر نہ ملا تو ملنے کا ہے آسرا عزیز

لہروں کا کیا شعار ہے واقف نہیں ابھی
مجبور ہو کے رکھتے ہیں ہم ناخدا عزیز

چلئے اگر یہی سہی معیارِ آدمی
سب کا بھلا عزیز ہے اپنا برا عزیز

رضوی صلہ بڑھا دیا ہے جہد عشق سے
اہل ہوس کو بھی ہوا کار وفا عزیز

10-3-96

☆☆

یارب اگر سزا و جزا تا ابد کی ہے
پھر فرصتِ گناہ ہمیں تا ابد تو دے

☆☆

گو مدتیں ہوئیں مگر ہے دل کو انتظار
شاید کہ تری دید کا لمحہ پلٹ آئے

☆☆

لے کر کے مرا نام پکارا نہیں کرتے
کس بزم میں وہ ذکر ہمارا نہیں کرتے

○

ہم کو جس شہر میں سناٹا نظر آتا ہے
اپنی رسوائی کا اک میلہ لگا دیتے ہیں

ترے کوچہ کی یہ رونق ہے ہمیں اتنی عزیز
اسکی خاطر تو رقیبوں کو دعا دیتے ہیں

اک تماشا سا سر شاخ چمن رکھنے کو
ہم خود ہی اپنے نشیمن کو جلا دیتے ہیں

اس کو دیوانگی شوق سمجھتے ہیں لوگ
عشق کرنے کی ہم اپنے کو سزا دیتے ہیں

ہم کہ ہاتھوں میں لیے زخمِ گریباں کا علم
آگ پہ چلنے کے آداب سکھا دیتے ہیں

رضوی دیوانے سہی اپنا ہنر تو دیکھو
ہم جہنم کو بھی گلزار بنا دیتے ہیں

○

نہ کسی حرف حکایت کی کھنک ہے نہ گلہ
خالی کشکول کی مانند صدا کا دامن

ہم گنہ گار سہی اتنا خلوص ہے ہم میں
ایک سجدے سے ہی بھر جائے خدا کا دامن

ماہ و خورشید کے ہوں بند قبا سے آزاد
سارا دامن کہ ستاروں کی ردا کا دامن

زلف لہرا دو مہک اُٹھے فضا کا آنچل
اک ذرا ہنس دو تو بھر جائے صبا کا دامن

اس ٹھہرتی ہوئی رفتار کا عالم جیسے
پھول کی ٹہنی سے الجھا ہو ہوا کا دامن

شعلہ مے شرر لالہ سے رنگیں پوشاک
شفق و روئے گل اور رنگ حنا کا دامن

میری شیرینی گفتار کا عالم رضوی
پھول اس لہجہ کے اور میری نوا کا دامن

○

ہر اضطراب میں جینا سکھا دیا ہم کو
شراب نے غم دنیا بھلا دیا ہم کو

ہر ایک شے سے اٹھا کر کے ہاتھ بیٹھ گئے
ان آندھیوں نے بہت آسرا دیا ہم کو

نہ جانے ان دنوں وحشت ہی کچھ زیادہ ہے
نوازش آپکی جو حوصلہ دیا ہم کو

جو بے نیاز ہم ہوتے تو اس کا کیا کرتے
ضرورتوں نے ہماری خدا دیا ہم کو

نہ کوئی پہلو شکایت کا نہ کسی سے گلہ
ہماری آگ تھی رضوی جلا دیا ہم کو

☆☆

اک خواب نہیں اس سے ملاقات ہماری
اس کا بھی یقین ہے ہمیں اپنا بھی یقین ہے

○

عمر گر وفا کرتی ہم کو فیض کیا ملتا
اور داغ سجدوں کے برسر جبیں ہوتے

اک طلسم حیرت ہے زندگی کی نیرنگی
کوئی دو حسین چہرے ایک سے نہیں ہوتے

جنت اور جہنم کا فیصلہ بھی سن لیتے
قصہ نو میں سارے برسرِ زمیں ہوتے

بیخودی تو تم سے بھی دور لے گئی ہم کو
تم سے دو گھڑی ملتے ہم اگر یہیں ہوتے

راس کس کو آتی ہیں خوش خیالیاں رضوی
کارگہ ہستی میں معجزے نہیں ہوتے

☆☆

اشک آئے کہ لہو آنکھوں سے
کچھ تو سوزِ غم نہاں کے لئے

○

خوابوں میں کھلی ہوئی ہیں آنکھیں
ہم سب نیند میں چل رہے ہیں

ناپختگی زبان کے مارے
ہر لمحہ لفظ بدل رہے ہیں

پہچان اپنی کھو گئی ہے
ایک مخمصہ میں پل رہے ہیں

دیواریں جھلس گئیں تپش سے
سائے سورج سے جل رہے ہیں

کیسی عجیب زندگی ہے
ہم اپنے آپ کو کھل رہے ہیں

☆☆

پھر ترا اعتبار کر بیٹھا
دل کی بد احتیاطیاں نہ گئیں

رنگینیِ عارض سے ہے رنگینیِ فضا کی
اس جسم کی خوشبو سے ہے توقیر صبا کی

پھولوں کا تکلم ہے کہ جنبش ہے لبوں کی
جھرنوں کا ترنم ہے کہ آہٹ کفِ پا کی

ہے تختۂ گل منعکس پیرہنِ یار
ہے موج نسیم سحر آنچل کی ہوا کی

تصویر ہے مہتاب سطح آب رواں پر
تنویر ہے آئینہ میں سورج کی ضیا کی

ایک التجا آمیز غرور آنکھوں میں رقصاں
شوخی بھی شرارت بھی تمازت بھی وفا کی

عارض ہیں کہ مے خانہ دہک اٹھتا ہو مے سے
زلفیں ہیں کہ ٹوٹی ہوئی مستی ہے گھٹا کی

رضوی وہ عجب فتنہ گر و فتنہ ربا ہے
قامت ہے قیامت کی تو انگڑائی بلا کی

غمِ دوراں غمِ جاناں غمِ ذات
نشاطِ غم کے کتنے سلسلے ہیں

خدا جانے وہاں کیا کر رہے تھے
ترے کوچہ میں خضر اکثر ملے ہیں

گریباں زخم زخم اسکا بھی ہوگا
ہمارے چاک بھی کم کم سلے ہیں

یہ دل ان کو کرے گا یاد برسوں
سحر تھے لوگ جو ہم کو ملے ہیں

یہ سناٹا کہاں سے آگیا ہے
شہر والوں ہمیں تم سے گلے ہیں

فسردہ گر طبیعت ہو تو رضوی
یہ سارے پھول سے موسم کھلے ہیں

27-4-97

زندگی کا عجیب عالم ہے ذہن میں دشت کا سا موسم ہے

اپنی آواز بری لگتی ہے اتنا لہجہ ہوا کا مدہم ہے

مے سے بھی اب نشہ نہیں ہوتا کچھ طبیعت ہی ایسی برہم ہے

جس سے دل کو سکون ملتا تھا اس سے ملنا بھی اب بہت کم ہے

خود پہ اپنی نظر نہیں پڑتی کیسا رسوائیوں کا عالم ہے

کیوں ہوا میں بکھرنے لگتا ہے گل پژمردہ کو اب کیا غم ہے

بڑھ گیا ہوگا اندھیرا رضوی یا دیئے میں ہی روشنی کم ہے

جیسے ہولی کے سب گڈ مڈ جگمگ کرتے رنگ
کالی زلفیں دھانی بانکیں اور گلابی رنگ

جیسے رخساروں کے پیچھے کھلے ہوئے ہوں گلاب
بھرے بھرے ہونٹوں سے جیسے چھلکے سرخ شراب

اس سے چھو کر ہوا رچائے خوشبوؤں کا میلہ
عنبر مہکے صندل مہکے مہکے گلاب اور بیلہ

پھیلا کاجل لانبی پلکیں اور متوالے نین
چندرما کے روپ ہیں جیسے جگمگ کرتی رین

☆☆

سناٹا، آنسو اور آہیں، کانٹوں سے سنجوگ
پیار میں لوگ لگا لیتے ہیں کیسے کیسے روگ

○

غمِ دوراں کی طرح تھا غمِ جاناں کا فریب
خود سے شرمندہ ہوئے چاک گریباں کر کے

بام و در قفل و سلاخوں پہ نہ کر ناز کوئی
چل پڑے اب کے اگر ہم رخِ زنداں کر کے

چاند کی روشنی میں جیسے گھٹا کھلتی ہے
ایسے آ جاؤ کبھی زلف پریشاں کر کے

سامنے کس کے کہیں ہم کہ متاع کچھ بھی نہیں
فائدہ خاک ہے رسوائی داماں کر کے

روشنی ماند کئے دیتے ہیں مہتاب کی ہم
لو دکھاتے ہیں تمہیں دل کو شبستاں کر کے

آئینہ خانے میں کیوں آئے تھے رضوی صاحب
کیا ملا تم کو بھلا آپ کو حیراں کر کے

○

پندارِ آبرو میں بہت بد دماغ ہیں
جھک کر جو نہ ملئے تو مسیحا سے نہ ملیں

اسکی گلی کے ایک سرے پر ہے کائنات
ممکن نہیں کہ جائیں تو دنیا سے نہ ملیں

بے فائدہ ہے زیست تو بیکار مرگ ہے
دنیا کو مسترد کریں عقبیٰ سے نہ ملیں

گر لامکاں کی اسکو نہ وسعت نصیب ہو
ہم آرزوئے شہر تمنا سے نہ ملیں

مانا تمیز دوست و دشمن نہیں رہی
یہ کیسے ہوسکے گا شناسا سے نہ ملیں

ناصح تمہاری بات بھی کتنی عجیب ہے
اوروں سے تو ملیں دل زندہ سے نہ ملیں

28-11-95

○

کوئی ایسا نگر بھی ہوتا ہے
جس میں واپس سفر بھی ہوتا ہے

اپنی وحشت نے ہی اجاڑ دیا
ورنہ اک اپنا گھر بھی ہوتا ہے

ہم نے دیکھا نہیں سنا تو ہے
کہ دعا میں اثر بھی ہوتا ہے

دل جو منت کش دوا نہ ہوا
نازشِ چارہ گر بھی ہوتا ہے

ایک نئی کائنات خود بھی ہے
وہ جو حد نظر بھی ہوتا ہے

29-11-95

○

اس کو رسوائی کہتے ہو یہ کیسی رسوائی ہے
ہم تو جہاں بھی جاتے ہیں اسکے قصیدے پڑھتے ہیں

اپنی وفا بھی نبھ جائے اور ایمان بھی بچ جائے
بت کو دل میں بٹھا لیتے ہیں اور پھر سجدے کرتے ہیں

عشق کے جھگڑے حسن کے قصے سب افسانے ایک طرف
سیدھی سچی بات یہ ہیکہ ہم تو آپ پہ مرتے ہیں

ہونٹوں کی پھیلی سی سرخی زلف پریشاں بہکے رنگ
کیسی قیامت ہوتی ہے جب ایسے آپ سنورتے ہیں

مے خانے میں جانے والا رضوی نہیں ہوتا
تیرا نام لئے بنا ہم پیمانہ کب بھرتے ہیں

30-11-95

دل دکھ جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے
پلکوں پہ اک شعلہ جیسا لگتا ہے

لذت کارِ دنیا میں بھی ملتی ہے
دل کا کاروبار بھی اچھا لگتا ہے

لوگ ہمیں جینے ہی نہیں دیتے ہیں یہاں
ورنہ شہر ہمیں بھی پیارا لگتا ہے

وہ چہرہ یا اک کتاب اور جام مے
وقت گذر جانے میں پھر کیا لگتا ہے

ایکا ایکی ساری کلیاں کھل اٹھیں
یہ منظر تو اس کا چہرہ لگتا ہے

پھولوں میں شبنم کی لرزتی بوندوں پر
افشاں چھڑکی ہو تو کیسا لگتا ہے

کیسا صحرا کیسی لیلیٰ لوگ انہیں کیا جانے ہیں
ایک حقیقت آبلہ پائی باقی سب افسانے ہیں

کوچہ جاناں دیوانوں کی دنیا سے تو بہتر ہے
دل بھی یہاں کم کم دکھتا ہے لوگ بھی کم بیگانے ہیں

مقتل اور کمیں گاہوں میں سب سے مل کر آئے ہیں
اس بستی کے سب چہرے اپنے جانے پہچانے ہیں

دل کا درد کہاں لے جائیں زخم کسے دکھلائیں ہم
یہی بات سمجھ نہ پائے اسی لئے دیوانے ہیں

پہلے ہم نے کب دیکھا تھا ایسی تباہی کا موسم
آنکھوں میں آنسو چبھتے ہیں چہروں پہ ویرانے ہیں

اب تم کس کو پوچھ رہے ہو کس کا حال سنائیں ہم
یہ جو جو ناسور بنے ہیں سارے گھاؤ پرانے ہیں

یہ مشعل جاں کہ جلائی ہے خود اپنے لوگ بجھادیں گے
اپنوں پہ بھروسہ کرتے ہیں رضوی کیسے دیوانے ہیں

○

پڑا ہے واسطہ اس بدگماں سے
سکوں کی زندگی لائیں کہاں سے

بیاباں اور بگولوں کا اثر ہے
شجر بھی ہوگئے نامہرباں سے

طلب کرتے ہیں تیری پرسش
یونہی یہ زخم رہتے ہیں عیاں سے

تپش سائے کو بھی جھلسا رہی ہے
زمیں لائی ہے یہ لپٹیں کہاں سے

نہیں لاچارگی و عشق کا میل
چلو اٹھو اب اس کے آستاں سے

یہی بہتر ہے گونگا ہو گیا ہوں
کسے ہے شوق میری داستاں سے

مرا ذوقِ نظر اب رہنما ہے
صحیفے آچکے سب آسماں سے

سفر کی جہت ہی باقی نہیں ہے
کہاں جائیں گے رضوی ہم یہاں سے

13-7-97

حسن نیرنگی جمال کے ہیں
ہم مصور ترے خیال کے ہیں

زرد پتوں میں لڑکھڑاتی ہوا
سب اشارے ہمارے حال کے ہیں

نازکی رنگ خوشبوئیں قامت
دل میں کیا ولولے وصال کے ہیں

چھو رہے ہیں قلم نئی صدیاں
نقش ہمارے بڑے کمال کے ہیں

چاندنی آب رواں پھول دئے
عکس سب آپ کے جمال کے ہیں

لب کا رنگ اور ہے عارض کا اور
یوں بدن رنگ سب گلال کے ہیں

جب سے ہم نے سنبھالے ہیں موسم
رنگ کچھ اور ماہ و سال کے ہیں

جس کا جی چاہے مڑ کے نہ دیکھے
رضوی رشتے سب اک خیال کے ہیں

☆☆

وعدے تو شیخ جی کے بہت ہی حسین تھے
پر ہم کو انتظار کی عادت نہیں رہی
ہم کو بھی کب وفا کے بکھیڑے عزیز تھے
اچھا ہوا تمہیں بھی محبت نہیں رہی

○

اچھا چلیے وحشی دل کا کوئی مداوا کرتے ہیں
عالم عالم اس مہ وش کے حسن کا چرچا کرتے ہیں

گھر کی دیواروں کے اندر اک صحرا بھی رکھا ہے
بادِ صرصر اور بگولے سب ہی تماشا کرتے ہیں

گرم ہوائیں روکیں کہیں سے برساتیں لے کر آئیں
آس کے سب سوکھے پیڑوں کو پھر سے زندہ کرتے ہیں

ہم سے سلوکِ اہل دنیا کوئی نفع نہ کوئی سواد
پھر بھی ایسے پاگل ہیں ہم دنیا دنیا کرتے ہیں

وہ قامت رنگ و نور رواں اور اپنی طبع روشن روشن
نیرنگیٔ حسن کو لفظوں کے سورج میں اتارا کرتے ہیں

○

ہر طرف جسم جسم چھالے ہیں
لوگ صحراؤں کے حوالے ہیں

کیسا بے برگ و بار ہے یہ شجر
کیسے موسم اترنے والے ہیں

سورہ فاتحہ ہمارے نام
آستینوں میں سانپ پالے ہیں

خضر کے پیر جلنے لگتے ہیں
ہم نے جو راستے نکالے ہیں

موج طوفاں بدوش آئی ہے
ریت کے گھر بکھرنے والے ہیں

☆☆

شاید اس میں ہمارا نام بھی تھا
کربلا والوں کا جو تھا محضر

○

بام و در کی سانسوں میں ریت کے سوا کیا ہے
ہم جہاں پہ بیٹھے ہیں خانۂ پریشاں ہے

اس کے جسم کا پرتو عکس آب پر دیکھو
گاہے دامنِ گل ہے گاہے گل بداماں ہے

ایک چراغ منزل کا ایک رہگذر کا ہے
عشق اور غم دنیا اک تسلسل جاں ہے

☆☆

دل کو اک لمس گداز آرزو بھی چاہیے
زندگی کرنے کو تجھ سے گفتگو بھی چاہیے

○

پائے رہزن کے لئے زنجیر کیوں بنتی نہیں
خاک رہ کو کچھ خیال آبرو بھی چاہیے

بندگی کے نشے میں خود داریوں کا بھی نشہ
سجدوں کے طاق میں جام و سبو بھی چاہیے

خنکی آب رواں کنج چمن سبزہ صبا
رنگ بھی خوشبو بھی مے بھی خوبرو بھی چاہیے

ذات کے قصے بہت ہیں کارِ دنیا بیشمار
آدمی کو آدمی کی جستجو بھی چاہیے

تین شعر

کس درجہ اعتماد ہمیں راہبر پہ ہے
ہم اپنے دشمنوں کو بھی پہچانتے نہیں

اس درجہ بدگماں ہوئے دوستوں سے آپ
دشمن کی دشمنی کو بھی گردانتے نہیں

مے خانہ اور تصرف واعظ ہیں تابہ کے
رندوں کو تم نے دیکھا تو ہے جانتے نہیں

☆☆

ختم ہے آبلہ پائی کا فریضہ ہم پر
ہم سلامت ہیں تو اس راہ میں ہیں خار بہت

خٹک ناچ

میں رقصاں
میں رقص کناں
شمشیریں ہیں دونوں ہاتھوں میں
آنکھوں ہیں انگاروں کی زباں
سرتال پہ پاؤں کی جنبش
بجلی کا کوندا رقص کناں
ایک لمحہ عیاں اک لمحہ نہاں
تلواروں میں سے گذرتا ہوا
حلقہ دست و بازوَ و جاں
پیروں سے لپٹی آندھیاں
شانوں سے اترتے ہیں طوفاں
شمشیر کا حلقہ بڑھتا ہوا
بازو کا گھیرا پھیلا ہوا
پتھریلی چٹانیں گاتی ہیں
جھرنوں سے ساز ابھرتے ہیں
تلواروں کی لو جب بڑھتی ہے
کہساروں کے سر جھک جاتے ہیں
یہ رقص ہے رقص شورجنوں
یہ رقص ہے رقص دشت لہو

کچھ تو اپنی نگاہ مدھم ہے
اور کچھ روشنی بھی کم کم ہے

نہ سمجھتا ہے نہ سمجھاتا ہے
ان دنوں دل کا عجب عالم ہے

حیرتِ بے حسی ہے آئینہ
سوز شعلہ نہ کیف شبنم ہے

ہم جو بیٹھے ہیں یونہی بیٹھے ہیں
اس کے آنے کی آس تو کم ہے

پھر وہی کعبہ وہی لات و منات
مدتیں ہوگئیں یہ سر خم ہے

27-11-96

احترام میکدہ لازم ہے لیکن کیا کریں
لب لہو کردے گا یہ جام وسبو ٹوٹا ہوا

اک تسلسل سے اگر ہوتا تو کتنا خوب تھا
سلسلہ ہائے شمار رنگ وبو ٹوٹا ہوا

بیخودی میں میری درمیکدہ اک بات ہے
اک ساغر ہے کنارِ آبجو ٹوٹا ہوا

امتحان قوت برداشت دیکھا چاہیے
لے کے ہم آئے تھے پائے جستجو ٹوٹا ہوا

رضوی امید نمو رکھنے کو ہمت چاہیے
تم اگر پاؤ جو نخلِ آرزو ٹوٹا ہوا

9-3-96

پھر وہی چاک گریباں ہے وہ ہی دل کی کشید
ہم یہ سمجھے تھے کہ شاید نیا موسم آئے

یہ الگ بات کہ ہم سے کہیں ٹھہرا نہ گیا
راستے میں تو ہمارے کئی عالم آئے

رنج ساقی سے ملے ہیں کہ یہ جی جانتا ہے
جام کو پھینکنے کے پھر بھی مواقع کم آئے

یہ مسافت یہ تھکن بھول کے چلتے جاؤ
کوئی منزل ہی نہیں جس پہ رکو اور دم آئے

تم سے دوبارہ ملاقات کی تمہید ہے یہ
گر بچھڑتے ہوئے آنکھوں میں تمہاری نم آئے

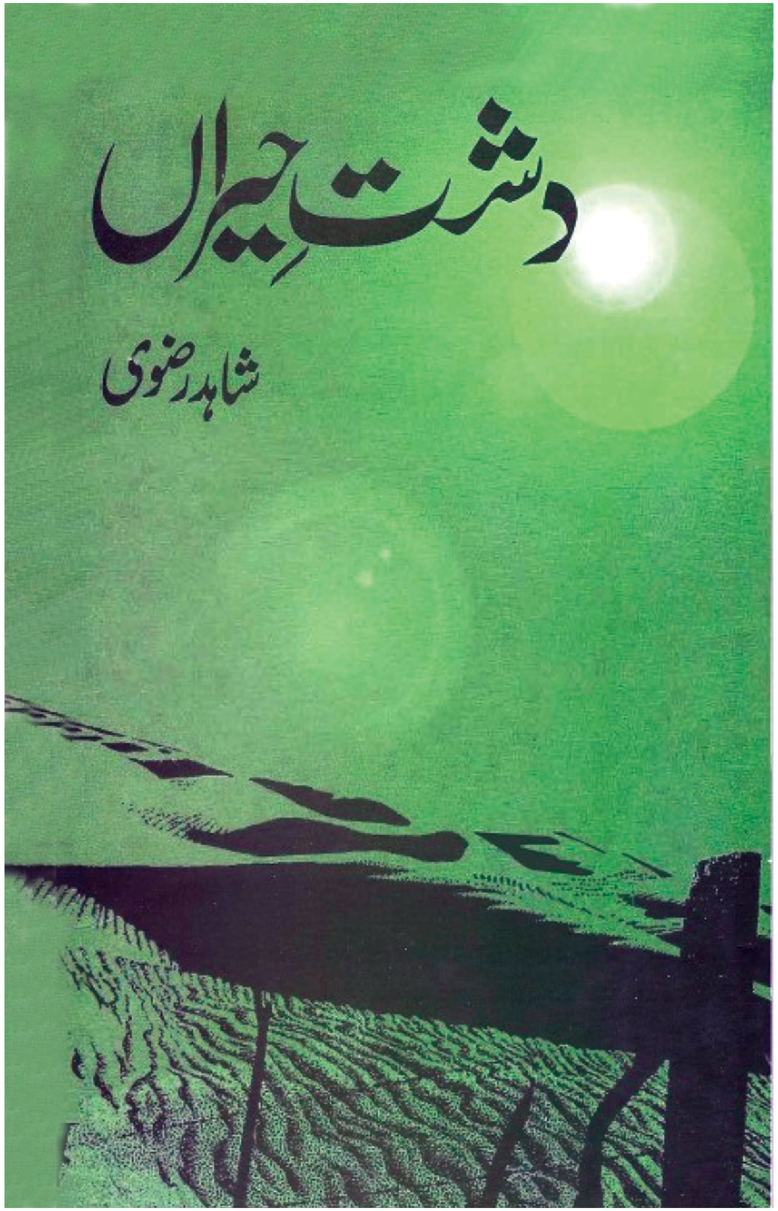
دشتِ حیراں
شاہد رضوی

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو اک نقشِ پا' پایا

غالبؔ

فاتح ہے جُہد البقا کا
اس جہد کی انتہا نہیں ہے
جب تک ہے کائنات باقی
انسان کو فنا نہیں ہے

شاہد رضوی

فہرست

☆......آتے ہیں مل کے ہم بھی غمِ روزگار سے ۴۳۸
☆......نام آوروں کے شہر میں گمنام گھومنا ۴۳۹
☆......اس شہرِ تجارت میں ہر چیز میسر ہے ۴۴۰
☆......ہم نے اسی شہر میں جینے کا ہنر ضائع کیا ۴۴۱
☆......ہم نے تو اس کی شکایات بہت کیں لیکن ۴۴۲
☆......اس کا احسانِ آشنائی ہے ۴۴۳
☆......لذتِ جستجو کی خاطر ہم ۴۴۴
☆......اپنی عمر یہیں بیتی ہے ہم کو کیا معلوم ۴۴۵
☆......اٹھا کے جام کو باہر اچھال دے ساقی ۴۴۶
☆......تم نے دستِ کرم ہی کھینچ لیا ۴۴۷
☆......کچھ زخم نہیں خنجر و ناوک کا کہ مر جائیں ۴۴۸
☆......کیا کہیے سرِ راہ ہے اس کو یہ شکایت ہے ۴۵۰
☆......آزردگیٔ جاں کا ہنر سیکھ رہے ہیں ۴۵۱
☆......دیہات کی امیری سے کہیں ۴۵۲
☆......ہر دل پہ اترتے نہیں چاہتے کے صحیفے ۴۵۳

☆......تجھ سے ملنے کے بہانے تو بہت تھے لیکن ۴۵۴
☆......ایسے لہرا کے چلی بادِ صبا پھولوں میں ۴۵۵
☆......عشق معراجِ لطافت ۴۵۶
☆......فضا کے رنگ بدلتے ہیں پیرہن چھو کر ۴۵۷
☆......سفر میں عمرِ رواں کے لہولہو ہی رہے ۴۵۸
☆......عرش پر بھی مرا پرچم ہے ۴۵۹
☆......کچھ فکر نہیں رکھتا ہے وہ سود و زیاں کی ۴۶۰
☆......مرے غم کی حیثیت کی مجھے اتنی ہی خبر ہے ۴۶۱
☆......عبرت نہ انفعال نہ شرمندگی کوئی ۴۶۳
☆......کہتے ہیں جنم لیتا ہے احساس عمل سے ۴۶۴
☆......گھر کی محرومیاں برداشت کریں مشکل ہے ۴۶۵
☆......کچھ وحشتِ دل بھی مانع رہی اور آس بھی کچھ بے آس رہی ۴۶۶
☆......ٹھہری ہوئی ہے فکر تو پابستہ یقیں ہے ۴۶۷
☆......درد سے دل نے آشنائی کی ۴۶۸
☆......ٹھہر گیا ہے کہیں دل، سمٹ گئی ہے نظر ۴۷۰
☆......نہ پوچھو حال ہمارے خمار کا واعظ ۴۷۱
☆......ہم قافلۂ خوشبوئے ایوانِ وفا ہیں ۴۷۲
☆......رفتارِ تغیر سے کہیں آگے گیا ہوں ۴۷۳
☆......اندیشۂ قاتل کے زیاں سے نہیں بچتا ۴۷۵
☆......اور کچھ اضطراب لے آئے ۴۷۶

☆......رند کو مے چاہیے واعظ کو ایماں چاہیے ۴۷۷
☆......نذر نام بہ وشانِ شوخ پیکر کیجیے ۴۷۸
☆......تجھ سے بچھڑ کے تنہا نہ چلتے پہ کیا کریں ۴۷۹
☆......بے اثر ٹھیری مسیحا کی دعا میرے بعد ۴۸۰
☆......آخری بار کی تکرار نہ کرتا یہ دل ۴۸۱
☆......پھر اور ہی شعار ترا کوئے یار ہو ۴۸۲
☆......اک دل خانہ خراب و بے نیاز ۴۸۳
☆......کیا جانئے کیا بات ہے اس کے کفِ پا میں ۴۸۵
☆......دنیا میں ہنگامہ برپا لگتا ہے ۴۸۶
☆......ایسی تاریکی ہے کہ نام بجھے جاتے ہیں ۴۸۷
☆......دھوپ سے تحفظ کو سائبان ڈھونڈا ہے ۴۸۸
☆......اک نقطہ پر ذہن رکے یا دل بے قابو ہوتا ہے ۴۸۹
☆......چاہی ہے نوازش بھی اگر اہل کرم سے ۴۹۰
☆......بیگانہ و مجذوب ہو دیوانہ کہ مجنوں ۴۹۱
☆......تعمیر ہنر مندی و جاں کاہی کاوش ۴۹۲
☆......یہ کیسی بستی ہے کوئی مری طرف ہی نہیں ۴۹۳
☆......رشتہ ہے عجب اس سے مرا کیا کیجیے ۴۹۴
☆......زیست کے مرحلے دشوار نہیں ہیں اتنے ۴۹۵
☆......چھیڑ دی ہم نے جہاں حسنِ دل آویز کی بات ۴۹۶
☆......رکنا نہیں کہ ایک تسلسل حیات ہے ۴۹۷

☆......حسن کی چھوٹ تو ہر دل کا متاع ہوتی ہے ۴۹۸
☆......اتنا پایاب ہے دریا کہ ٹہل کر چلیے ۴۹۹
☆......شعلہ مے سے کچھ اس طور سلگتے ہیں ایاغ ۵۰۰
☆......دل رنجیدہ کو اکثر یہی سمجھاتے ہیں ۵۰۱
☆......ہم جس سے ڈر رہے تھے وہی بات ہو گئی ۵۰۲
☆......گھر میں یوں لگی آگ کہ دل جلنے لگا ہے ۵۰۳
☆......خاموشی و انکار و تغافل و تجاہل ۵۰۴
☆......بے خودی لے گئی ہے کتنے زمانے میرے ۵۰۵
☆......درد و غم کا بڑا سرمایہ جمع ہے دل میں ۵۰۶
☆......شبنم کی فنا غنچہ شگفتہ ہونا ۵۰۷
☆......آنکھیں ہماری اس کے سراپا پہ رک گئیں ۵۰۸
☆......شوق آوارگی سلامت ہو ۵۰۹
☆......اپنے لیے تو حسن کا ہے بانکپن غزل ۵۱۰
☆......مے خانہ ہے یہ، رند یہاں آتے رہیں گے ۵۱۲
☆......ہے غیر میں بس ایک یہ خرابی کہ سر بزم ۵۱۳
☆......تخیل کا شعروں میں ہمارے جو سبب ہے ۵۱۵
☆......بنتی نہیں ہے غم سے ترے، روزگار کی ۵۱۶
☆......اس کو کسی بھی چیز سے کم تر نہ جانیے ۵۱۷
☆......عقبیٰ بھی میرا میکدہ ہے ۵۱۸
☆......دل تھا ہمارا یار پرانا گذر گیا ۵۱۹

☆......شعلہ رخ شررے گل و لالہ آتش ۵۲۰

☆......جب سے یہ زندگی ملی ہے ہمیں ۵۲۱

☆......اک پھول تعلق کا اگر کھلنا نہ چاہے ۵۲۲

☆......ڈرتے ہو اگر پیرلہو نہ ہو جائے ۵۲۳

☆......عشق کا تجربہ ضروری ہے ۵۲۴

☆......دیکھنے والے بہت لوگ تھے لیکن ہم نے ۵۲۵

☆......ہر دانش کا اپنا عہد ہے ہر سچائی وقتی ہے ۵۲۶

☆......لطف قد گیسو سے کچھ انکار نہیں ہے ۵۲۷

☆......دیوانے ہیں ہم کو کہیں آرام نہیں ہے ۵۲۸

☆......اس چہرے پہ پلکوں کو اٹھا کر دیکھیں ۵۲۹

☆......خوش گمانئ قامت آپ پر نہیں زیبا ۵۳۰

☆......اس سے وفا کی آس نہیں ہم بھی کیا کریں ۵۳۱

☆......خیال آیا سر گرداب ہم کو ۵۳۲

☆......مردہ تن کے لبوں پہ ہنسی ڈھونڈنا ۵۳۴

☆......خواب میں بیداری کیسی بیداری ہے ۵۳۵

☆......اس دل کو ہر اک شام جو امید سحر ہو ۵۳۶

☆......نئے انداز سے یہ بزمِ فسوں جاری ہے ۵۳۷

☆......تیری چاہت تو بس ایک ہی دھارا ہے ۵۳۸

☆......لطف ایسا ہے پس کرب کہ جی جانے ہے ۵۳۹

☆......ہر لمحہ ایک تحیر کی فضا ہوتی ہے ۵۴۰

☆......تیرے آنے کی توقع میں گلستاں دیکھیں ۵۴۱

☆......حسرتیں عہد جوانی کی بہت ہیں لیکن ۵۴۳

☆......احساس ذمہ داری آداب بزم ہے ۵۴۴

☆......اجنبی چہروں پہ کیا ہو آشنا کی جستجو ۵۴۵

☆......تشنہ مے سہی، رہنا سرے خانہ ہے ۵۴۷

☆......ایک کانٹا سا خراشیں ڈالتا ہو قلب پر ۵۴۸

☆......حاکم سے تو ہم کو بھی بہت کام ہیں لیکن ۵۴۹

☆......ایک رہزن بیچتا ہے دوسرے رہزن کے ہاتھ ۵۵۰

☆......سرحدیں ملکوں کی دو گام پہ آ پہنچی ہیں ۵۵۱

☆......شوق، امید، عشق حیرت ہے ۵۵۲

☆......غیرتِ عشق کا احساس رہا کرتا ہے ۵۵۳

☆......آنے کی توقع ہی نہیں اس کی ادھر کو ۵۵۴

☆......ہمیں ملی نہیں فرصت کبھی ترے غم سے ۵۵۶

☆......عالم ہے اک تماشہ بازار دیکھیے ۵۵۷

☆......ہمت فزا تو اس کی کوئی بھی ادا نہ تھی ۵۵۹

☆......برق نگہ آنکھ کی پتلی سیاہ کرے ۵۶۰

☆......شدت نے موسموں کی بدن توڑ دیا ہے ۵۶۱

☆......رنگوں سے کہکشاں کے ہے دامن بھرا ہوا ۵۶۲

☆......طلب شعلہ وصال کے نام ۵۶۳

☆......تنہائی بدگمانیوں کا کاروبار ہے ۵۶۴

☆......عمر بھر دل کو بے قرار کیا ۵۶۵
☆......دل زندہ کے امتحان کے لیے ۵۶۶
☆......ہر اک سمت ہیں رقصاں ترے جمال کے رنگ ۵۶۶
☆......حیراں کیے دیتی ہے عارض کی یہ سرخی ۵۶۹
☆......وہ سنگ سرِ راہ مرا زادِ سفر تھے ۵۷۰
☆......رہن مے کر دی صرف غم کر دی ۵۷۱
☆......لطف باراں ہے جو شعلہ سا بدن بھیگا ہو ۵۷۲
☆......کیا جانے شب کب آئی ۵۷۳
☆......کس شے سے بنی ہے بے قراری ۵۷۴
☆......اک لطف جہد ابتلا کا ۵۷۶
☆......یہ اجالا میرے دماغ کا ۵۷۷
☆......نفرت کے واسطے تو یہ دنیا بنی نہیں ۵۷۹
☆......راہ پر خار تمنا تو کہیں ختم نہیں ۵۸۱
☆......کچھ غم دل کا مداوا نہیں کرنے پائے ۵۸۲
☆......عمر گذری ہے ادائیگی کرتے ۵۸۳
☆......الفاظ، قلب و ذہن کی حرمت ہیں اور شعر ۵۸۴
☆......سب رنج و ملال ہیں گوارا ۵۸۵
☆......نہ جانے کیا ہے زمانہ کہیں قیام نہیں ۵۸۶
☆......وابستہ ہو گئے ہیں نئے روزگار سے ۵۸۷
☆......کون لائے سفر دشت تمنا کی خبر ۵۸۸

☆......آج کی قدروں سے گر میل نہیں پاؤ گے ۵۹۰
☆......آسمانوں سے زمین کا معاملہ درپیش ہے ۵۹۱
☆......اور کوئی ہوتا اس سے جھگڑا کرتے ۵۹۲
☆......پرنیاں سی نرمی ہے سوز سی گھلاوٹ ہے ۵۹۳
☆......بند کوئے قاتل ہے اور در مسیحا بھی ۵۹۴
☆......حدیث دوست ہو سننا اگر تو ہم سے سنو ۵۹۶
☆......میکدہ اک رشتۂ لمس متاع گرداں ہے ۵۹۷
☆......رکا ہے وقت ترے انتظار میں کب سے ۵۹۸
☆......آنکھوں کی پتلی ٹھہرا ہے نطق و لب کا مان ہوا ۶۰۰
☆......دل یک ذرہ شش جہت ہو جہاں ۶۰۱
☆......ہم نے رفاقت غم جاناں شعار کی ۶۰۲
☆......کرب ساری عمر کا دار و رسن سے بیش ہے ۶۰۳
☆......لوگ وہ مقابل تھے جان بوجھ کر ہم نے ۶۰۴
☆......اس کے ہونٹوں کے دو کناروں بیچ ۶۰۶
☆......اوہام بھی زیادہ ہیں حکایات بہت ہیں ۶۰۸
☆......آندھی میں ترس گیا ہوا کو ۶۰۹
☆......زینت سر ہے خاک پائے حسین ۶۱۰
☆......گردش جام نہ ہو جرات رندانہ نہ ہو ۶۱۱
☆......زندہ رہنے کے میسر نہیں ساماں کوئی ۶۱۲
☆......ہماری تشنہ لبی، میکدے کی بربادی ۶۱۳

☆......بند ہے مہ خانہ کا در چلیے واپس چلتے ہیں ۶۱۵
☆......قائم نہ ہو یقیں تو کیا جہت فکر کی ۶۱۷
☆......ہم سے اس جسم کی خوشبو کا بیاں مت پوچھو ۶۱۹
☆......لذت وصل گئی ہجر کا آزار گیا ۶۲۰
☆......وہ لو ہو وہ جگر گیا وہ بھی ۶۲۱
☆......آزردگان شہر کوئی بات تو کرو ۶۲۲
☆......سبزہ وتختہ گل سرد ہوا آتشیں مے ۶۲۳
☆......اس کے چہرے کی بات مت پوچھو ۶۲۴
☆......ایک قصیدہ بنام نومولود ۶۲۷
☆......اس جمال رخ رنگیں کی مدح کیجیے رقم ۶۳۱
☆......کچھ نیند کے جھونکوں کو ملے زلف کا سایہ ۶۳۲
☆......ایسی آیت حسن پہ پہلے کب اتری ۶۳۳
☆......نغموں پہ محبت کے بدن جھوم رہے ہیں ۶۳۴
☆......اپنی ذات کے آگے میں نے ۶۳۵
☆......کار دنیا غم جاناں سے بھی مشکل نکلا ۶۳۷
☆......آتی ہے بیاباں سے جو یا ہو کی صدا اور ۶۳۸
☆......تین شعر ۶۳۹
☆......امن کی خاطر ۶۴۰

☆......☆

○

آتے ہیں مل کے ہم بھی غمِ روزگار سے
یارانِ مے کدہ کو ہمارا سلام ہو

دل کا یہاں لگاتے ہیں یہ لوگ کتنا مول
دیکھیں اگر یہاں کوئی نیلام عام ہو

دن کو ہو آفتاب کی مانند ضوفشاں
شب کو وہ چہرہ، چہرۂ ماہ تمام ہو

تشخیصِ ذات آدمی کا احترام ہے
عزت سے لیجیے خواہ وہ دشمن کا نام ہو

☆☆

یہ کیا ہوا کہ غریبِ شہر کے جانے سے
تمام شہر ہی بے مایہ ہوگیا لوگو

نام آوروں کے شہر میں گمنام گھومنا
اپنا تو اک شعار ہے ناکام گھومنا

ہاتھوں میں خالی جام لئے میکدے کے پاس
معمول بن گیا ہے سرِ شام گھومنا

دامن میں سنگ ہائے ملامت جمع کئے
شانوں پہ ڈالے پوششِ الزام گھومنا

ترکِ تعلقات چھپانے سے فائدہ
لے کر کے تیرا نام سرِ عام گھومنا

بے رحم دھوپ تند ہوا سنگلاخ راہ
ان سب سے پڑ گیا ہے ہمیں کام گھومنا

اس شہر تجارت میں ہر چیز میسر ہے
کتنے کا نبی لو گے کتنے کا خدا لو گے

انصاف تو ہوتا ہے معیار الگ ہوں گے
میں ساری سزا لوں گا تم ساری جزا لو گے

کیا دل کے دھڑکنے کی آواز سناتے ہو
کس دام میں بیچو گے کتنے کا نیا لو گے

جب شہر ہی ویراں ہو پھر کس کا حساب ہوگا
جب لوگ نہیں باقی پھر کس کی وفا لو گے

ہیں داغ بھی آنسو بھی آہیں بھی لہو بھی ہے
کس کس کی جزا دو گے کس کس کا صلہ لو گے

○

ہم نے اس شہر میں جینے کا ہنر ضائع کیا
منزلیں ایسی ملی ہیں کہ سفر ضائع کیا

شعر بے ربطیٔ افکار سے بوجھل ٹھہرے
ناز تھا جس پہ وہ اندازِ نظر ضائع کیا

تختۂ گل میں لہو رنگ ہے کانٹوں کی بہار
جانے کیا سوچ کے یہ خون جگر ضائع کیا

اپنی امیدوں کو خود آگ لگادی ہم نے
دل میں برسوں سے جو پالا تھا شرر ضائع کیا

آپ کو راہ گذر چاہیے تھی سو ہم نے
اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا گھر ضائع کیا

○

ہم نے تو اس کی شکایات بہت کیں لیکن
کچھ توجہ نہیں دیتا دلِ ناداں اپنا

معتبر کرنے کو اندازِ جنوں شہر کے بیچ
چاک کرتے ہیں چلو ہم بھی گریباں اپنا

کھل گئی ذائقہ میں چبھنے لگی آنکھوں میں
جھاڑنے لائے تھے جس خاک سے داماں اپنا

گیسو و قامت و رفتار سے آشفتہ سری
رنگِ رخسار و لبِ یار سے زنداں اپنا

ٹوٹ جائے جو کبھی حدِ طلسم من و تو
پھر ٹھہرتا ہی نہیں ذہنِ گریزاں اپنا

○

اس کا احسان آشنائی ہے
اجنبی کی طرح ملا تو سہی

منکرِ وصل ہوگیا، ہو جائے
ایک لفظ ہی کہا، کہا تو سہی

دعوے سب تیرے حق میں چھوڑ دئے
اے مرے دوست مسکرا تو سہی

اس نے بھی چاک گریباں کیا
خیر یہ بھی سنا، سنا تو سہی

راہ دل دیکھتا رہا اس کی
اور دو دن جیا، جیا تو سہی

○

لذت جستجو کی خاطر ہم
آج پھر اس کا پتہ بھول گئے

کیسا انسان ملا ہے یارو
اس کے ملنے میں خدا بھول گئے

ڈھونڈنے جائیں تو کہاں جائیں
اس کا نقشِ کفِ پا بھول گئے

یوں لگا زخم سے لہو رسنے
ہم سلاسل کی صدا بھول گئے

☆☆

کچھ ہم سے انجان رہے کچھ سے ہم انجان رہے
ورنہ اس محفل میں تھے سب ہی جانے پہچانے لوگ

اپنی عمر یہیں بیتی ہے ہم کو کیا معلوم
جنگل سے باہر بھی کوئی رستہ جاتا ہے

کیسا سناٹا ہے کہ پتے بھی نہیں ہلتے
دیوانہ مر جائے تو جنگل چپ ہو جاتا ہے

اور کوئی کیا ہم کو اپنی وحشت راس نہیں
دل میں اک ہنگامہ سا ہے دل گھبراتا ہے

وسعتِ دل میں یونہی پھرتے ہیں آوارہ ہم
چلیے یہ صحرا ہے لیکن راس تو آتا ہے

☆☆

قافلے والوں میں اک دشت فغاں چھوڑ گئی
پیاس کی لہر سسکنے کے نشاں چھوڑ گئی

اٹھا کے جام کو باہر اچھال دے ساقی
بقدرِ ظرف نہ ہو مے تو ہم نہیں پیتے

گزارتے کہیں راتیں کہیں پہ دن کرتے
کسی کو ہم سے گلہ کیا ہے ہم کہیں پیتے

سوادِ دیر و حرم ہی تمام جل جاتا
کچھ اور کرکے اگر مے کو آتشیں پیتے

نشاطِ سجدہ بھی اس میں شمار کر لیتے
جو بس چلے تو بھگو کر کے ہم جبیں پیتے

☆☆

یہ ارتقائے عشق کی خانہ خرابیاں
عالم تمام حلقۂ دامِ جنوں ہوا

○

تم نے دستِ کرم ہی کھینچ لیا — کیا کریں اب خوئے سوال کا ہم
دیکھیے جس کو ہے گریباں چاک — کیا بتائیں اب اپنے حال کا ہم
داغِ قلب و جگر سے رکھتے ہیں — سب حساب اپنے ماہ و سال کا ہم
وہ تو رخ ہی ادھر نہیں کرتا — حوصلہ کیا کریں سوال کا ہم
عمر بے فیض گزاری ہم نے — بوجھ لادے پھرے وبال کا ہم
اک شبِ ہجر کاٹنا ہے کام — حوصلہ رکھتے ہیں کمال کا ہم

○

کچھ زخم نہیں خنجر و ناوک کا کہ مر جائیں
ہے موجۂ الزام گزر جائے گی سر سے

بس ایک قدم اور، بدل جاتی ہے دنیا
ویرانہ یہاں دور ہی کتنا ہے شہر سے

اب پھرتے ہیں حیراں کہ پتہ ہی نہیں معلوم
کیا سوچ کے ہم ڈھونڈنے نکلے اسے گھر سے

چوکھٹ ہی نہیں در میں مگر اس کو کریں کیا
دستک کی صدا آتی ہے ہم کو اسی در سے

پوچھو تو سہی بیتی ہے کیا راہ گزر میں
کچھ لوگ ابھی لوٹ کے آئے ہیں سفر سے

ہم شوخیِ اندازِ قبا دیکھ رہے تھے
عالم ہی پرے ڈوب گیا حدِ نظر سے

کیا طرفہ تماشہ ہے یہ آئینِ نمو کا
سبزہ ہے بیاباں سے تو وحشت مرے گھر سے

تین شعر

کیا فائدہ اے خضر تمہیں آبِ بقا سے
بہتر ہے کہ مرنے کی دعا مانگو خدا سے

مشکل یہ ہے دونوں سے بنائے نہیں بنتی
کچھ کام بتوں سے ہے تو کچھ کام خدا سے

نہ گل کی مہک ہے نہ لبِ یار کی خوشبو
کس کس کی شکایت کریں ہم بادِ صبا سے

○

کیا کہیے سر راہے اس کو یہ شکایت ہے
اس شہر میں رہتے ہو تم پھر بھی نہیں ملتے

اک دل کی اداسی ہے اک چہرہ کی ویرانی
اور اس کے تصنع سے دونوں ہی نہیں ملتے

میں نے کہا ملنے کو لب بستہ و چپ تھا وہ
ہاں کہنا اگر چاہتا یہ ہونٹ نہیں ملتے

لمس ہاتھوں کو مل جاتا لفظوں کو زباں ملتی
کیا ملنا سرِ راہے ملتے تو کہیں ملتے

وہ وقت تھا چہرے پہ مہتابیاں چھٹتی تھیں
کندن سا بدن ملتا مہتاب جبیں ملتے

یا آج وہ عالم ہے ملتے ہیں بچھڑنے کو
اور بچھڑے ہوئے شاید دوبارہ نہیں ملتے

آزردگئ جاں کا ہنر سیکھ رہے ہیں
سیکھا نہیں جاتا ہے مگر سیکھ رہے ہیں

کل ہم کو بھی اس بزم سے کچھ کام پڑا ہے
اس بزم کے آدابِ نظر سیکھ رہے ہیں

ایسا نہ ہو ویران نہ ہو جائے دوبارہ
کیسے کوئی بنتا ہے نگر سیکھ رہے ہیں

آشفتہ سری، سنگ ملامت، دل پرخوں
اس شہر میں جینے کا ہنر سیکھ رہے ہیں

☆☆

خیرات کسی شخص کو دینا بھی کٹھن ہے
محسوس یہ ہوتا ہے کہ میں مانگ رہا ہوں

دیہات کی امیری سے کہیں — بہتر ہے مفلسی شہر کی

قناعت کی زندگی سے یارو — بہتر ہے خاک دربدر کی

طوفاں کی گونج اٹھ رہی ہے — تم خیر مناؤ بام و در کی

ساحل پہ بیٹھا سوچتا ہوں — کب ہوگی واپسی لہر کی

☆☆

لوگ ایسے بھی قتل ہوتے ہیں
آدمی وحشتوں سے ہار گیا
طفلِ معصوم کو بچا نہ سکی
زندگی تیرا اعتبار گیا

ہر دل پہ اترتے نہیں چاہت کے صحیفے
ہر اک کے لئے اسکی ادائیں نہیں ہوتیں

رہزن کو بھی معلوم ہے ہم کو بھی خبر ہے
جس راہ پہ ہم ہیں واں پناہیں نہیں ہوتیں

مژگاں نہیں کہتے ہیں جو دل میں نہ اتر جائے
جو پار نہ ہو جائیں نگاہیں نہیں ہوتیں

آواز شکست ہے یہ دل شیشہ گراں کی
شیشوں میں تو خود اپنی صدائیں نہیں ہوتیں

کیا سوچ کے اس در پہ صدا دیتے ہو رضوی
وا بہرِ گداگر کبھی باہیں نہیں ہوتیں

☆☆

جی کو لگتے بہانے مل جاتے
تجھ کو آساں پھر بھلا پاتے

تجھ سے ملنے کے بہانے تو بہت تھے لیکن
لذتِ ہجر کچھ ایسی تھی کہ ملنے نہ گئے

دل کے زخموں کو رفو خود نہ کیا ہم نے کبھی
چاک یہ تیری نظر سے کبھی سلنے نہ گئے

دشت کی اپنی ہی کچھ آب و ہوا ہوتی ہے
پھول گلشن کے کبھی دشت میں کھلنے نہ گئے

اس قدر پیارا تھا وہ اولین آدم کا گناہ
ہم فرشتوں کی روش پہ کبھی چلنے نہ گئے

تازہ کرلیتے ہیں اکثر تری یادوں کو ہم
یہ الگ بات کہ تجھ سے کبھی ملنے نہ گئے

☆☆

در بدر پھرے برسوں غرقِ مے رہے اکثر
کوئی تو بہانہ ہو تجھ کو بھول جانے کا

○

ایسے لہرا کے چلی بادِ صبا پھولوں میں
جیسے اس بزم کا کچھ ذکر کیا ہے ہم نے

کون کہتا ہے کہ بھاری ہے بہت عشق کا بوجھ
اپنی بانہوں میں اسے تول لیا ہے ہم نے

تجھ کو دکھلانے کو واماندگی نشہ مے
ہوش میں رہنے کا الزام لیا ہے ہم نے

صرف گرنا نہیں آتا ہے نشہ پی کے ہمیں
خود کو گرتے میں سہارا بھی دیا ہے ہم نے

یہ جو کچھ شعر مہکتے ہوئے کہہ لیتے ہیں
اس کی خوشبو سے بڑا کام لیا ہے ہم نے

تین شعر

عشق معراجِ لطافت سے جنم لیتا ہے
بوئے گل موجہِ مے لمسِ صبا کی مانند

ہے تحیّر کہ گنہ گار ہے انساں کتنا
پھر بھی معصوم ہے ایسا کہ خدا کی مانند

زندگی کا بھی سلوک ہم سے ہے جاناں جیسا
دشمن جاں کی طرح دستِ شفا کی مانند

☆☆

اثبات و تغیر ہو رفتار و سکوں ہو
شہ مات نہیں ہوتی کہیں فکرِ رسا کو

فضا کے رنگ بدلتے ہیں پیرہن چھو کر
صبا کو ہوش نہیں ہے ترا بدن چھو کر

کہاں پہ داغ کہاں آبلے کہاں پہ لہو
تلاش کرتے رہے اپنا خستہ تن چھو کر

دھنک کے رنگ میں لپٹی یہ روشنی کی پھوار
تمہارے رخ سے چلی آئی کرن چھو کر

کہاں تھا پہلے یہ رنگ یہ خمار یہ خوشبو
بہار لوٹ رہا ہے تمہیں چمن چھو کر

یہ رم یہ آن یہ مستی یہ بے نیاز خرام
غزالاں آئے ہو تم کس کا بانکپن چھو کر

صبا سے کہہ دو ترے لمس سے وہ مہکا دے
گزر بھی جائے کسی دن مرا سخن چھو کر

سفر میں عمر رواں کے لہو لہو ہی رہے
تمام راہ میں پھیلی تھیں کرچیاں دل کی

یونہی تو موج سے یہ رابطہ نہیں رکھتا
ہے تشنگی مسلسل حیات ساحل کی

ہر ایک دل میں تری بزم کا ہے نقش الگ
ہر ایک نقش میں صورت ہزار ہے دل کی

رہے گا یونہی سلامت تسلسلِ غم دل
رہے گی تابہ ابد روشنی یہ محفل کی

ہمارا کام تھا خرمن جمع کئے ہم نے
اگرچہ کوئی توقع نہیں تھی حاصل کی

ہماری فکر میں راہوں کے جال اُلجھے ہیں
تلاش ورنہ تو مشکل نہیں تھی منزل کی

○

عرش پر بھی مرا پرچم ہے   آدم کے گناہ کی قسم ہے
آگے کی بات سوچتے ہیں   جو کچھ اب تک کیا وہ کم ہے
جس سے جھگڑتا ہوں خدا ہے   اور پوجتا ہوں جسے صنم ہے
نہ مے ہے نہ ابر نہ صبا ہے   تم ہی نہیں تو پھر کیا غم ہے
میری کٹی انگلیوں کو دیکھو   ان میں اب تک مرا قلم ہے

○

کچھ فکر نہیں رکھتا ہے وہ سود و زیاں کی
کب ہے شکن آلود جبیں آبِ رواں کی

کام آئے نہ احباب نہ ناصح نہ مسیحا
بیکار توقع رہی دلداریِ جاں کی

نالہ میں ہمارے گو اثر کوئی نہیں ہے
خاموش رہینگے تو خجالت ہے فغاں کی

معلوم ہوا آہ شبِ ہجر سے ہم کو
یوں لوٹ کے آتی ہے صدا خالی مکاں کی

کیا کیجئے اب دشمنی غیر کا شکوہ
یوں ہے کہ مری بات ہی دشمن ہے زباں کی

○

مرے غم کی حیثیت کی مجھے اتنی ہی خبر ہے
یہ ہجومِ چارہ سازاں مرے غم سے معتبر ہے

تری سمت سے چلے تھے تری سمت ہی رواں ہیں
غمِ دل کی رہ گذر میں یہ عجیب سا سفر ہے

ذرا تیز تیز چلئے یہ جو کہکشاں سے آگے
نئی رہ گذر بنی ہے اسی پہ ہمارا گھر ہے

وہ جو ایک دل ہمارے سینے میں ہے دھڑکتا
وہی دشتِ لامکاں ہے وہ بے مکاں سا گھر ہے

میں تلاش کررہا ہوں مری منزلیں کہاں ہیں
مرا آخری سفر بھی مرا اوّلین سفر ہے

جو لہو لہو سا گذرا ہے صبا کے راستے سے
رگِ گل سے میرے دل تک یہ بہار کا سفر ہے

نہ خفا ہو شیخ مجھ سے کہ حرم کے طاق و در میں
میں اسی صنم کو دیکھوں یہی حد مری نظر ہے

نہ جنوں بلا خرد کے نہ خرد بلا جنوں کے
یہ ملامتوں کی راہیں مری سوچ کا سفر ہے

☆☆

تم بھی تو جاتے ہو واعظ تم کو کبھی نشہ ہوا
مستی تو دل میں ہوتی ہے پیمانہ یونہی بدنام
جن کو یقین ہے جن کو وہم ہے دونوں آ کر گرتے ہیں
جانے کس نے پھیلایا ہے وہم و یقین کے بیچ یہ دام

○

عبرت نہ انفعال نہ شرمندگی کوئی
اک سعی تھی ہماری جو ناکام ہوگئی

چاہا تھا اک دو گھڑی صحرا میں گھومنا
آئے تھے ہم صبح سے یہیں شام ہوگئی

کل اس گلی میں لے کے ہم انکو چلے گئے
حجت جناب ناصح کی اتمام ہوگئی

آوارگئ دل کی دُھن میں گذر گئی
یہ شب بھی ہجرِ یار ترے نام ہوگئی

شاید وہ آ بھی جاتا مگر اس کو کیا کریں
دن بھی کہیں رکا نہیں اور شام ہوگئی

○

کہتے ہیں جنم لیتا ہے احساس عمل سے
کیا بھول سکوں گا نہ ملوں اس سے جو کل سے

جب اس سے ملاقات ہو اس وقت نہ آئے
آتے ہوئے یہ عہد لیا ہم نے اجل سے

پہچانتے ہیں آج ابد کے مزاج کو
جنت سے نہیں آئے ہیں ہم لوگ ازل سے

سایہ جہاں افعی کا ہو بے فیض شجر ہے
ملتا ہے زہر پیاس بجھاتے ہوئے پھل سے

رکھتا ہے ہر اک لمحہ حساب اپنے عمل کا
نقصان نہیں آج کو بے فیضیِ کل سے

☆☆

رشتے یاری سوچ نظریہ فکر عمل
جو شئے ہم آہنگ نہ ہو چبھنے لگتی ہے

گھر کی محرومیاں برداشت کریں مشکل ہے
ہاں مگر بیچ میں آدرش کوئی حائل ہے

کم نہ تکمیلِ تمنا سے ہوئی بے تابی
سر پٹکتی ہے جہاں موج وہیں ساحل ہے

اک تماشہ مری وحشت کہ ہدف بھی میں ہوں
کیسا خرمن ہے عجب برق عجب حاصل ہے

فتنۂ اہرمن و حضرت یزداں کے بیچ
یہ جو اک مابہ نزاع چیز ہے میرا دل ہے

اپنی خود داریوں نے رد کی یہ کہہ کر جنت
ہم نکالے گئے تھے یاں سے یہ وہ محفل ہے

مرا اندازِ گل افشانی گفتار ہے تو
مری آواز میں لہجہ بھی ترا شامل ہے

کچھ وحشتِ دل بھی مانع رہی اور آس بھی کچھ بے آس رہی
اس در پہ دستک تو دیدی، واں ہم سے مگر ٹھہرا نہ گیا

بے بال و پر کی شکل میں ہو یا صورت ہو زنجیروں کی
یہ صحن چمن وہ کنج قفس ، صیاد کا تو پہرا نہ گیا

کیا سنگ سر رہ ریگ جنوں کیا موج حوادث سیلئی مے
ہر شے سے ذہن کھرچ ڈالا اور ذہن سے وہ چہرہ نہ گیا

نہ قرض متاع جاں ٹھہرا نہ رہن غم جاناں ٹھہرا
اس تیرہ شبی میں کیسے کہوں وہ دور سنہرا تھا نہ گیا

رنگ قلب ونظر کے لاکھوں تھے اس جاں پہ سجائے بیٹھے تھے
جب اس دوکان میں لوٹ پڑی مت پوچھو کہ کیا کیا نہ گیا

کتنے بندھن توڑ کے چھوڑے کتنے رشتے ساتھ رہے
اس بزم میں تنہا آیا تھا جب اٹھا تو تنہا نہ گیا

ٹھیری ہوئی ہے فکر تو پابستہ یقیں ہے
حالات بدل جاتے ہیں اور ذہن وہیں ہے

اللہ رے واماندگی کیفیتِ دل
میں آؤں گا واپس یہ اسے پختہ یقیں ہے

اے عرش بریں اس کا خمیر اور الگ ہے
آسان نہیں ہونے کا یہ کارِ زمیں ہے

سجدے میں اثر ہے نہ لجاجت میں کچھ حاصل
شرمندہ ہیں ہم اس سے کہ بے فیض جبیں ہے

کم کردی ہے لو تیرگی اہلِ ہوس نے
سورج سے زیادہ تو ضیا پاش زمیں ہے

آواز یہ کہتی ہے یہ نغمہ ہے ازل کا
اور دل کا یہ کہنا ہے کہ یہ ساز یہیں ہے

درد سے دل نے آشنائی کی
اپنے دشمن کی پذیرائی کی

لہجہ رکھتے ہیں اجنبی کا سا
بات کرتے ہیں شناسائی کی

پر شکستہ کا حکم ہے جس میں
ہے اسی میں خبر رہائی کی

زندگی کس قدر دگرگوں ہے
بات کرتے ہو کبریائی کی

بات ہے اختیار کی ورنہ
تم سے جتنی بنی خدائی کی

کھو دیا اپنے آپ کو ہم نے
ایک ہی بات کی بھلائی کی

اس سے زیادہ جفا تو نہ کیجیے
حد بھی ہوتی ہے آشنائی کی

جانے کیسا دوانہ تھا مجنوں
دشت نے جس کی پذیرائی کی

لامکاں کا طلسم بکھرے گا
اس کی مرضی ہے خود نمائی کی

خضر کو دیکھیے عجب شے ہیں
آج بھی ضد ہے رہنمائی کی

☆☆

جن زخموں سے جانبر نہ ہوئے
سب چارہ گر سے آئے تھے

○

ٹھہر گیا ہے کہیں دل، سمٹ گئی ہے نظر
نہ جانے کیسے ترا انتظار رک سا گیا

غریبِ شہر نے جب سے یہاں صدا دی ہے
امیرِ شہر کا کچھ کاروبار رک سا گیا

بسا غنیمت ہے یہ بھی فریب پیہم میں
جنوں عشق کا کچھ اعتبار رک سا گیا

امیدِ شوق سرِ صحن گلستاں کم ہے
کہیں پہ قافلۂ نو بہار رک سا گیا

خبر تو لاؤ کہ اہلِ جنوں پہ کیا گذری
کوئی غبار سرکوئے یار رک سا گیا

رہِ امید و عمل کی تلاش میں اکثر
ہوا ہے یوں کہ مرا اختیار رک سا گیا

○

نہ پوچھو حال ہمارے خمار کا واعظ
لہو کے بدلے رگوں میں شراب بہتی ہے

گذر گئی ہے جو سر پہ فلک سے مت پوچھو
یہ داستان تو ہم سے زمین کہتی ہے

شمار کیجیے تو وقت ہے وگرنہ کچھ بھی نہیں
یہ عمر ہم سے یونہی بے نیاز رہتی ہے

سموم و صرصر و خاک و نمی اشک و لہو
ہوائے دشت بھی کتنے عذاب سہتی ہے

قدم قدم پہ مدارات اشک و خون جگر
کبھی کبھی تو بڑی ہی بہار رہتی ہے

○

ہم قافلۂ خوشبوئے ایوانِ وفا ہیں
پہچان ہماری ہے کہ ہم بادِ صبا ہیں

شب کلفت امروز میں گزرے تو گزر جائے
ہر صبح کی ساعت کے لئے تازہ ہوا ہیں

ہشیار ہو اے مہتمِ عہد بہاراں
ہم صحنِ چمن کو جرس گل کی صدا ہیں

تا دیر کوئی بوجھ نہیں رکھتے ہیں دل پر
رُکتے نہیں اک لمحہ کو آزاد ہوا ہیں

شمشاد قداں کے لئے پابستۂ زنجیر
لالے کے لئے ہم دل پر خوں کی ادا ہیں

آواز ہیں مہکار کے کھلنے کی ہوا میں
پھولوں کے لیے بوسہ شبنم کی صدا ہیں

○

رفتارِ تغیر سے کہیں آگے گیا ہوں
اے کائنات میرے مقابل سفر میں آ

ابھرا ہوا افق کی سطح سے ہے آفتاب
دشتِ حدود و وسعتِ امکاں نظر میں آ

دیکھیں کہ انتہائے غمِ عشق کیا رہے
اے جانگدازیِ شبِ ہجراں نظر میں آ

وا تجھ پہ ہیں کئے ہوئے در کائنات کے
آ دردِ آگہی میں، دلِ بے خبر میں آ

سایے کے پیچھے چلتے ہوئے عمر ہوگئی
اے سایہ گر سرو قداں رہگذر میں آ

پھر ہو رہی ہے سنگِ ملامت کی جستجو
اے ذوقِ زخم و کاوشِ درماں نظر میں آ

تنگ آ گئے ہیں مشغلۂ دربدری سے
اے شہرِ انتشار سمٹ کر کے گھر میں آ

تین شعر

لذتِ زخم کچھ ایسی تھی کہ میں نے چاہا
یا خدا میرے مسیحا کی دعا رد ہوجائے

فطرتِ حسن میں لازم ہے جفا جو ہونا
اس نے کب چاہا تھا کہ میری وفا رد ہوجائے

وعظ اور مے کے مقابل یہ دعا کون کرے
موسم خشک رہے کالی گھٹا رد ہوجائے

○

اندیشۂ قاتل کے زیاں سے نہیں بچتا
دل مصلحتِ چارہ گراں سے نہیں بچتا

وہ قصہ آدم ہو کہ ہو ذکر ہمارا
رنگینی داماں کے بیاں سے نہیں بچتا

جس کپڑے کی تقدیر میں تشکیلِ قبا ہو
وہ چاک گریباں کے نشاں سے نہیں بچتا

کم ہوتا نہیں دوریوں سے دردعزیزاں
یہ دل ہدفِ ناوکِ جاں سے نہیں بچتا

رضوی برا نہ مان کبھی یوں بھی ہے کہ دل
آزردگئی ہم نفساں سے نہیں بچتا

○

اور کچھ اضطراب لے آئے
اس سے ملے تھے آج ہم بھی

ہے دوسری سمت ذات میری
ایک سمت خدا بھی ہے صنم بھی

فطرت ایسی ہے آدمی کی
ہر بات بیش بھی ہے کم بھی

ساتھ افسردہ سی نظر کے
لے چلئے اشکِ نم بھی

یا رب کچھ نئے نصیب لکھ دے
فرسودہ ہوئے لوح بھی قلم بھی

گر کوزۂ گل دھرا ہوا ہے
پھر توڑ دیجیے جامِ جم بھی

○

رند کو مے چاہیے واعظ کو ایماں چاہیے
اپنی اپنی خواہشوں کا سب کو زنداں چاہیے

دو عناصر ہوں تو بنتا ہے غزالاں کا مزاج
خوئے وحشت چاہیے اور دشتِ حیراں چاہیے

ریگِ صحرا کی طرح سنگِ ملامت آئے ہیں
اس ذخیرہ کے لیے بھی اک بیاباں چاہیے

اے مسیحا کیا ہے معیار شفا بخشی ترا
کتنی گہرائی تلک یہ زخم عریاں چاہیے

اے ریاکاری و پُرکاری خدارا رحم کر
ساری دنیا سے ہمیں بس ایک انساں چاہیے

وضع بدلے گی تو دنیا کو بھی سمجھا لیں گے ہم
چاک دامن تک جو آئے وہ گریباں چاہیے

○

نذر نام مہ و شانِ شوخ پیکر کیجیے
زندگی نعمت ہے اس کو صرف بہتر کیجیے

عشق و مستی کی سزا گر عشق و مستی سے ملے
آپ پر لازم ہے پھر یہ جرم اکثر کیجیے

آپ کا دل آپ کی باتیں نگاہیں آپ کی
یہ چراغ ہیں آپ کے سب گھر منور کیجیے

سب بلا تفریق فکر و ذوق آتے ہیں یہاں
در حرم کا میکدے کے تو برابر کیجیے

☆☆

اچھا ہوا چلو مری تنہائیاں گئیں
خوش ہوں کہ گھر کو لوگوں نے رستہ بنا لیا
ہم نے وفورِ شوق میں تازہ مکاں کے
بوسیدہ چھت کو اپنے ہی اوپر گرا لیا

تجھ سے بچھڑ کے تنہا نہ چلتے پہ کیا کریں
دل نے قبول ہی نہ کیا ہمسفر کوئی

ساحل پہ ساری عمر بھی بیٹھے رہو تو کیا
کب آشنا ہوئی ہے کسی کی لہر کوئی

فرصت نہیں ہے جیب وگریباں سے ہاتھ کو
کیا تازہ واردات میں اب پیٹے سر کوئی

اس دور کی ہیلو سے کوئی فائدہ نہیں
کیا دستکوں سے ہوتا ہے آباد گھر کوئی

کر دیجئے غرق ساغر مے کائنات کو
کیا فکرِ بے نوائی شام و سحر کوئی

بے اثر ٹھیری مسیحا کی دعا میرے بعد
زخم کو باقی نہیں کوئی گلہ میرے بعد

میں ہی آیا ہوں سر دشت تمنائے وصال
ہے لہو رنگ ہر اک گل کی قبا میرے بعد

جانے کیوں ضائع ہوئی دیدہ تر کی شبنم
جانے کیوں بند ہوئے چاکِ قبا میرے بعد

کشتئ تھا نگہ شیخ میں میں رند خراب
مے سے رنگتا ہے وہ دستار و قبا میرے بعد

کوئی آتا ہی نہیں چاک گریباں کرنے
ختم ہے سلسلہ اہل وفا میرے بعد

نہ کوئی داغ جگر ہے نہ کوئی سینہ زخم
کہاں ٹھہرے گا دل آبلہ پا میرے بعد

نہ ہوا چلتی ہے نہ خاک وہاں اڑتی ہے
لوگ کیوں ہیں دلِ ویراں سے خفا میرے بعد

آخری بار کی تکرار نہ کرتا یہ دل
آخری بار اگر مجھ سے وہ مل کر جاتا

تھی رضا تیری جو آدم کو دیا ذوقِ گناہ
یہ وہ الزام نہیں ہے جو مرے سر جاتا

رہ گیا سوچ کے توہین ہے طغیانی کی
پار کرنا تو مرے بس میں تھا میں کر جاتا

شہر کا نقشہ ہی یاروں نے بدل ڈالا ہے
راستہ ہوتا جو معلوم تو میں گھر جاتا

اس پہ خوش ہوں جو یوں کٹ جائے وبالِ دنیا
دردِ سر گر نہیں جاتا تو مرا سر جاتا

کارِ دنیا تو بہرحال بڑھے چلنا تھا
گر براہیم نہ جاتے کوئی آذر جاتا

پھر اور ہی شعار ترا کوئے یار ہو
ترکِ وفا پہ ہم کو اگر اختیار ہو

ہوں آج مدح خواں نمود زمین گُل
پوشیدہ جس کے پردے میں کل کی بہار ہو

رنگ چمن، ہوائے بیاباں سبھی کو ہے
اچھا ہے گر تمہیں بھی مرا اعتبار ہو

دشمن کا گر میں چاہوں برا تو برا نہیں
ڈرتا ہوں یوں نہ ہو مرا دل شرمسار ہو

جب تم عزیز ہو تو ہمیں سب عزیز ہے
روزِ وصال ہو کہ شبِ ہجرِ یار ہو

لطفِ وصال یہ ہے کہ تو تہہ بہ تہہ کھلے
بانہوں میں تو ہو اور ترا انتظار ہو

○

اک دل خانہ خراب و بے نیاز
جرأت اظہار کو کیا چاہیے

میکدہ کیا شے ہے کوئے یار کیا
آدمی کو ایک تماشہ چاہیے

رنگ و بوئے گلستاں بھی خوب ہے
ہاں مگر دل اپنا زندہ چاہیے

زخم کتنے لے سکے گی اپنی روح
آزمانے کو یہ دنیا چاہیے

وسعت چاک جنوں کچھ کم نہیں
اے دل پرخوں تجھے کیا چاہیے

جنبشِ تارِ رگِ جاں بیش ہو
عشق کو اک تازہ نغمہ چاہیے

ہو اگر دردِ غریبی کا ہجوم
آدمی ایسے میں تنہا چاہیے

ہم تو اچھے ہیں بتوں سے کیا ملا
دوسروں کو بھی تو اچھا چاہیے

کچھ نہ ہو اپنا تماشہ دیکھیے
بیکسی ہائے تمنا چاہیے

☆☆

نہ خدائی نہ بندگی کا ذوق
کتنا مشکل ہے آدمی ہونا

○

کیا جانئے کیا بات ہے اس کے کفِ پا میں
چلتا ہے مگر تیرتا چلتا ہے فضا میں

وارفتہ و آشفتہ و وارستہ ہے عالم
کیسی سحر آگینی ہے خوشبوئے وفا میں

نہ موجۂ گل موج صبا موجۂ مے میں
وہ بات نگہ غلط انداز ادا میں

غنچہ کا سا کھلنا ہے بدن کا سا سمٹنا
ہے سارا چمن ڈوبا ہوا رنگ حنا میں

کچھ ذکر ہوا ہے تری آمد کا چمن میں
اک لہر نظر آئی تو ہے ہم کو صبا میں

☆☆

بنے تو کیسے بنے اس کو نقد دل درکار
اور ہم تو جان بھی اپنی اُدھار رکھتے ہیں

○

دنیا میں ہنگامہ برپا لگتا ہے
بچے شور کریں تو اچھا لگتا ہے

اب تو سفر کی عادت ایسی ہوگئی ہے
کبھی کبھی تو گھر بھی رستہ لگتا ہے

جب سے آکے ہم نے خیمے گاڑے ہیں
یہ ویرانہ بھی اب کیسا لگتا ہے

اس کے جھوٹ پہ غصہ تو آتا ہے مگر
سچ یہ کہ وہ بھی اچھا لگتا ہے

بیچ سمندر میں جا کرکے تو دیکھو
یارو دور سے ساحل کیسا لگتا ہے

☆☆

دوستو سوچ کے پتھر پھینکو
آئینہ بے اثر نہیں ہوتا

ایسی تاریکی ہے کہ نام بجھے جاتے ہیں
شام ہی سے یہ در و بام بجھے جاتے ہیں

روشنی داغ جگر میں نہیں اب باقی کوئی
ہم نے جو پائے تھے انعام بجھے جاتے ہیں

نہ کرن کوئی امیدوں کی نہ دن باقی ہے
دل نے پھیلائے تھے جو دام بجھے جاتے ہیں

میکدہ تو سدا روشن ہی رہا کرتا ہے
بات یہ ہے کہ مرے جام بجھے جاتے ہیں

مشعل لذتِ آلام کی ضو ختم ہوئی
ہم پہ جو آئے تھے الزام بجھے جاتے ہیں

حرف اشکوں کی روانی میں بہے جاتے ہیں
یورش شب ھیکہ سب نام بجھے جاتے ہیں

دھوپ سے تحفظ کو سائبان ڈھونڈا ہے
بادلوں کے سایہ کا اک مکان ڈھونڈا ہے

ساری عمر کھوئی ہے چند حرف لکھنے میں
اک شعر میں ہم نے اک جہان ڈھونڈا ہے

آسمان کے ہاتھوں میں آفتاب دیکھے ہیں
زندگی کے ہاتھوں میں آسمان ڈھونڈا ہے

ذوق گمرہی ہم کو اب جہاں بھی لے جائے
ایک راستہ ہم نے بے نشان ڈھونڈا ہے

ہم تلاش پر اپنی خود ہی اتنے حیراں ہیں
دل کی ان حدوں میں اک لامکان ڈھونڈا ہے

اک نقطہ پر ذہن رکے یا دل بے قابو ہوتا ہے
جانے کیا آزار تجھے اے وحشی کی ہو ہوتا ہے

صحن گلستان میں لاکھوں رنگ کی مہکاریں بستی ہیں
لیکن جو بھی پھول کھلے یاں اس کی خوشبو ہوتا ہے

خاک کی وقعت جان جس سے ساری شکلیں بنتی ہیں
جن میں کوئی خورشید بکف اور کوئی مہ رو ہوتا ہے

دل کو کچھ بے مہر کریں گے تب ہی اس سے بات ہوگی
ایسا سنگدل کب دیکھا ہے جو وہ خوش رو ہوتا ہے

☆☆

دکھ ملتا ہے پر اس کا مداوا نہیں ہوتا
جو زخم بھی لگ جاتا ہے اچھا نہیں ہوتا

چاہی ہے نوازش بھی اگر اہلِ کرم سے
مانگا نہیں کم ہم نے کبھی ساغر جم سے

رہتی ہیں بہت مصلحتیں دل کے تئیں یاد
سرزد کبھی غلطی نہیں ہوتی ہے قلم سے

یہ جام یہاں رہنے دو جنت کو ہٹالو
اب اپنا گزارا نہیں ہو پائے گا کم سے

ہے ایسی طبیعت کہ کسی سے نہیں بنتی
جھگڑا ہے بہت شیخ سے رنجش ہے صنم سے

بس دردِ تہہِ جام میں ہی جھک اٹھے رضوی
کم ظرفی ہے یہ ڈوب کے مرجاؤ شرم سے

بیگانہ و مجذوب ہو دیوانہ کہ مجنوں
کچھ اور نہیں ہے یہ مدارج ہیں وفا کے

تکلیف بہت دیتے ہیں پیروں کے یہ چھالے
ہاں زخم ہیں کچھ اور دل آبلہ پا کے

کہتے تو ہیں اوروں کو سنانا نہیں ہوتا
ہوتے ہیں ہدف جاں کے ہم اپنی صدا کے

کس شہر میں لے آئے ہمیں یار ہمارے
جھونکے یہاں آتے ہی نہیں تازہ ہوا کے

☆☆

آج کی رات دل محزوں پر
درد کے کتنے صحیفے اترے

تعمیر ہنر مندی و جاں کاہی کاوش
مزدور کا دیوار پہ احسان بہت ہے

دامان وفا اس کی کہانی سے بھرا ہے
اس ننھے سے پروانے میں بھی جان بہت ہے

دنیا بڑی مشکل سے سنواری گئی جگ میں
کیا ظلم قیامت ہے جو آسان بہت ہے

اچھا چلو جنگل کو نکل جاتے ہیں وحشی
یہ شہر ترا ہم سے پریشان بہت ہے

خود اپنی ہی آواز سے باتیں کریں رضوی
کہتے ہیں کہ یہ راستہ سنسان بہت ہے

○

یہ کیسی بستی ہے کوئی مری طرف ہی نہیں
فراز دار پہ ہوں اور کوئی شرف ہی نہیں

جمع تو ہم نے کبھی کچھ سنگ کر لئے لیکن
کسے نشانہ بنائیں کوئی ہدف ہی نہیں

متاع داغ جگر کون اب سنبھالے، ہمیں
سوائے چاک گریباں کوئی شغف ہی نہیں

کھلا ہے عقدہ افلاک جب سے سوچتے ہیں
عجیب گھر ہے کہ جس کی کوئی سقف ہی نہیں

یہ کارزار کہ ہیں سب کے سب اسی کی طرف
ہمارے دوستوں کی اس میں کوئی صف ہی نہیں

طلسم حسن کا اب کس پہ آزماتے ہو
میانِ اہل حرم کوئی منحرف ہی نہیں

○

رشتہ ہے عجب اس سے مرا کیا کیجیے
دامن ہے تہہ سنگِ وفا کیا کیجیے

ہے خوف کہ ناآشنا ہو جائے گا
خوش باش دمِ رسم جفا کیا کیجیے

رکھتی ہے ہرے زخم امیدیں تازہ
اے شوخیٔ اندازِ صبا کیا کیجیے

ہر حال میں اس دل کو لہو ہونا ہے
ہے پیشِ نظر رنگِ حنا کیا کیجیے

ساغر تو ابھی ہاتھ سے چھوٹا ہی نہیں
گھر آئی ہے لو پھر سے گھٹا کیا کیجیے

○

زیست کے مرحلے دشوار نہیں ہیں اتنے
اتنے آساں گزر جائیں یہی مشکل ہے

کب تلک ساتھ چلے گا یہ تمہارے جانے
اسے مجھ سے بھی خفا ہونا ہے آخر دل ہے

ہم تو پھر گھرے سمندر کی طرف چل نکلے
اپنی فطرت کو وہی عافیتِ ساحل ہے

گردش ارض پہ موقوف نہیں اپنا سفر
ہم جہاں ٹھیرنا چاہیں گے وہی منزل ہے

صلہ عرض ہنر اس کے سوا کچھ بھی نہیں
اک ہنر مندی کا احساس مرا حاصل ہے

○

چھیڑ دی ہم نے جہاں حسنِ دل آویز کی بات
غیر کی بزم کھلی حلقہ یاراں کی طرح

سارے عالم کی توجہ کا ہے مرکز رضواں
ذکر کرتا ہے ترا ہم سے غزلخواں کی طرح

سخت جانی بھی ہے بے مثل طبع نازک بھی
صرف انساں ہی ہوسکتا ہے انساں کی طرح

مدتوں بعد جو ہوتا ہے ہمارا پھیرا
در ہمیں روکتا ہے چشم نگہباں کی طرح

دیکھنا ذوق اسیری تو نہیں ہے دل میں
کوئی آواز ہمیں دیتا ہے زنداں کی طرح

حسن میں کیسا تحیر ہے کہ سب قلب و ذہن
کیسے ساکت ہوئے ہیں دیدہ حیراں کی طرح

رکنا نہیں کہ ایک تسلسل حیات ہے
جب تک یہ کائنات ہے ہم کو ثبات ہے

امید وصل زندہ و تابندہ رکھ کہ دل
یہ ہجر کی جو شب ہے یہ بس ایک رات ہے

تصویر ایک عارض و لب کے طلسم کی
دل کے نگار خانے کی یہ کائنات ہے

آئینہ نگاہ میں ہی دھند چھا گئی
عکس خیال یار بھی اب ایک بات ہے

سکہ رواں بتوں کا ہو تو اور کیا کریں
بہتر یہاں عبادتِ لات و منات ہے

☆☆

اک عمر گئی ڈھونڈتے وہ سمت مجھے
جس سمت سے دریا میں بھنور نہ جاتے

حسن کی چھوٹ تو ہر دل کا متاع ہوتی ہے
غیر سے مل کے چلیں کوچہ جاناں کی طرف

پھر کبھی دیر و کلیسا و حرم دیکھیں گے
آج کی شام چلیں محفل رنداں کی طرف

تم نے منہ پھیر لیا ہم سے چلو یونہی سہی
رخ کیے لیتے ہیں ہم بھی دلِ ویراں کی طرف

ہم بھی ہیں راہ میں شاید کہ صبا لے آئے
کوئی پیغام بہاروں کا غزالاں کی طرف

ہم سے غلطی یہ سرِ بزم ہوئی تھی رضوی
یونہی نسبت اسے دی یوسف کنعاں کی طرف

☆☆

اب وہ عکسِ جمالِ یار کہاں
آئینہ میں اتر آئے پتھر

اتنا پایاب ہے دریا کہ ٹہل کر چلیے
بے وزن ہم ہی بس ایسے ہیں کہ یوں بہتے ہیں

دل کو عالم کے مقابل جو کیا ہے ہم نے
آئینہ خانے میں تصویر کے دکھ سہتے ہیں

دل وحشی کو کسی دشت کا باسی نہ جان
لوگ رہتے ہیں جہاں ہم بھی وہیں رہتے ہیں

ایسے حالات ہیں ہر لمحہ بری سوچوں میں
اپنے ہی آپ سے سہمے ہوئے ہم رہتے ہیں

آپ کے حسن تغافل کا بیاں کرتے ہیں
اور یہ بات جو ہے آپ ہی سے کہتے ہیں

معاف کردیجیے گا بے خبری کو میری
کیا کہیں آپ سے ہم آپ میں کم رہتے ہیں

شعلہ مے سے کچھ اس طور سلگتے ہیں ایاغ
جلتے ہیں جیسے کف دست حنائی پہ چراغ

کچھ نہیں چاک گریباں کا سبب اس کے سوا
تھے طلبگار ہوائے سر رہ سینے کے داغ

وائے واماندگی و بے کسی حسرتِ دل
نہ شب ماہ کی چاہت نہ چراغاں کا دماغ

سطح سے ملتا نہیں گہرے سمندر کا مزاج
چہرہ سے کھلتا نہیں کیفیت دل کا سراغ

کوئی دم آ کے ٹھہرتا ہی نہیں موسم گل
جانے کیوں کشت تمنا کو ملی فطرت باغ

ہم پہ موقوف نہیں روشنی بزم جنوں
رقص افکار سے جلتے ہیں یہاں روز چراغ

دلِ رنجیدہ کو اکثر یہی سمجھاتے ہیں
جو بھلا کرتے ہیں کب اس کا صلہ پاتے ہیں

کہتے ہیں دشت کا سناٹا یہاں پر بھی ہے
آج کی شب چلو ہم شہر میں رہ جاتے ہیں

درد کی لہروں سے بنتے ہیں صحیفے جتنے
ہجر کی شب دلِ مخزوں پہ اتر آتے ہیں

وسعتِ آئینہ کو وسعتِ صحرا کم ہے
آپ کے عکس سے تو صرف بہل جاتے ہیں

آپ کو عرض تمنا کی طلب ہے ہم سے
ہم توقع بھی اگر رکھیں تو گھبراتے ہیں

آج کل بات بھی کرنے کا نہیں ہم کو دماغ
آپ سے ملنے تعجب ہے چلے آتے ہیں

ہم جس سے ڈر رہے تھے وہی بات ہوگئی
اس کی نظر کی چال سے شہ مات ہوگئی

کیا مے کدہ وہ کوچۂ جاناں پہنچ گئے
واعظ سے کل وہیں پہ ملاقات ہوگئی

ہر لمحہ سوچ سوچ کے کارِ جہاں کیا
معلوم یہ ہوا کہ خرافات ہوگئی

خوئے طلب، اساس امید کرم پہ ہے
یہ کیا کہ بیٹھے صبح سے اور رات ہوگئی

دوشِ صبا پہ رقص کناں ہے خمار میں
صحنِ چمن کی خاک بھی سوغات ہوگئی

گھر میں یوں لگی آگ کہ دل جلنے لگا ہے
کس کس سے شکایت کریں ہم اپنے کیئے کی

آنکھوں میں نئی جوت ہے ذہنوں میں چراغاں
نعمت ہے یہ سب روشنی دو جام پیئے کی

یہ اتنے بڑے گھر کا در و بام اجالا
منت کش تصویر ہے ننھے سے دیئے کی

گر ڈھونڈنا چاہتے تو خدا مل گیا ہوتا
وہ کاوش و کوشش جو نگاراں کے لیئے کی

دشنام و ملامت کو جمع کر تو سکیں گے
کچھ کیفیت ہی اور ہے دامن کے سیئے کی

خاموشی و انکار و تغافل و تجاہل
اس شوخ کے اقرار کا ہر رنگ نیا ہے

وہ ایک مسرت کہ جو تعمیر نو میں ہے
سو کہنہ در و بام گرانے کا صلہ ہے

کیا دستِ گدا گر ہے؟ توجہ ہی نہیں دی
یا رب میرا کشکول نہیں دستِ دعا ہے

تسکیں دل وحشی کی ہے بس راہ نوردی
منزل سے غرض ہے نہ خبر راستہ کیا ہے

یہ راہ گذر سیدھی ہے چلتے چلو رضوی
جلتا ہوا وہ سامنے اس دل کا دیا ہے

☆☆

افسوس کیا ہے خضر کہ دنیا ہے اس کا نام
کی تھی بھلائی موجبِ الزام ہوگئی

بے خودی لے گئی ہے کتنے زمانے میرے
مجھ کو لوگوں نے سنائے ہیں فسانے میرے

ہے تھکا ماندہ مسافر یہ اسے سونے دو
کوئی کہتا ہوا گزرا ہے سرہانے میرے

بارش سنگ رہیگی میں رہوں یا نہ رہوں
اور آئے گا کوئی عہد نبھانے میرے

کار فرما ہے ترا حسن مگر یوں بھی نہیں
تجھ کو بہلانے کی خاطر ہیں بہانے میرے

کیسے مانوں کہ تغافل ہے حقیقت اس کا
کیسے ممکن ہے وہ احساس نہ جانے میرے

تجھ کو توفیق اگر ہو مجھے واپس کردے
کچھ ترے نام پہ لکھے ہیں زمانے میرے

درد و غم کا بڑا سرمایہ جمع ہے دل میں
اک خرمن سا لگا رکھا ہے بازار کے بیچ

دل کے سودے پہ جو تکرار اگر ہوجائے
مال بک جائے گا اپنا اسی تکرار کے بیچ

ہاتھ انگڑائی کو اٹھے نہ کوئی بات کہی
کوئی بات اور ہے انکار اور اقرار کے بیچ

ناتوانی ہی سہی پھر بھی لئے بیٹھے ہیں
اک فہرست گناہوں کی دلِ زار کے بیچ

ٹھہر جاتی ہے کہاں راستہ میں موج خیال
اک سناٹا سا ہے شورش افکار کے بیچ

تری تصویر کسی دانے پہ آتی ہے ضرور
خواہ تسبیح کے بیچ آئے کہ زنّار کے بیچ

○

شبنم کی فنا، غنچہ شگفتہ ہونا
بے مہری و مہر ہے یہ اسی ایک کرن کی

جذبات کبھی غیر مرئی نہیں ہوتے
احساس سے ہل جاتی ہے بنیاد بدن کی

گر اس میں نئے عہد کی تحقیر نہیں ہے
پھر سن لو اگر بات چلے رسم کہن کی

ہے حد چمن سے ملا دیوانے کا صحرا
رونق ہے اس آواز سے بھی صحن چمن کی

بہرا تو نہیں کوئی مگر سنتا نہیں ہے
کیا خاک شکایت کریں دنیا کے چلن کی

☆☆

جو آگ کے بعد کچھ بچا تھا
وہ گھر بارش میں بہہ گیا ہے

○

آنکھیں ہماری اس کے سراپا پہ رک گئیں
اور جانے کس طرف سے زمانہ گزر گیا

زنجیر در پہنچتے پہنچتے ہی تھم گئی
دم بھر کو بھی رکا نہ مسافر گزر گیا

باتیں ہیں اس کی سادہ و پرکار اس قدر
اقرار ہم سے کر ہی رہا تھا کہ پھر گیا

اس کو تو اعتبار غم عشق ہی نہیں
دعویٰ ہمارا ہو کے محلِ نظر گیا

برداشت کر نہ پایا غم روزگار کو
سنتے ہیں ایک شخص تھا رضوی وہ مر گیا

شوقِ آوارگی سلامت ہو   عشق کرتے ہیں غزل کہتے ہیں
خوش نہیں اپنے کئے پر ہم بھی   بے سبب آپ خفا ہوتے ہیں
اپنی ہی آگ میں سلگتے ہیں   اپنے ہی دل پہ داغ سہتے ہیں
ہم سے احوال یہاں کا مت پوچھ   ہم ترے شہر میں کم رہتے ہیں
داغ ہوتے ہیں بہاروں میں ہرے   ہم خزاؤں میں جنہیں سہتے ہیں

اپنے لیے تو حسن کا ہے بانکپن غزل
شیوہ ہمارا عشق ہمارے سخن غزل

رشتے ہیں تیرے حسن سے دونوں بندھے ہوئے
معراج درد عشق ہے معراج فن غزل

ترتیبِ نغمگی زباں کی چمن طرار
آہنگ حسن حرف کی سرو سمن غزل

الفاظ کی نشست میں معنی کی رازداں
باد صبا کی رو میں گلوں کا چلن غزل

فکر بلند شعر کے احسان کی اسیر
پرواز ہے ہما کی، ہے اوج سخن غزل

میں ہوں اور حسنِ یار کی مدح سرائیاں
شاداب تر بہارِ گل و یاسمن غزل

دل کو ہے پھر تلاش شرحِ آرزوئے دوست
نیرنگ میگساری و حسن چمن غزل

ہر حال میں ہمارے لیے غمگسار ہے
شام غریب شہر کہ صبحِ وطن غزل

☆☆

زندگی اڑتی ہوئی خاک کی مانند کٹی
جو کسی کو نہ ملے ہم کو وہ آزار ملے
دشت در دشت ہے آشفتگیِ جاں کا ہنر
دشت در دشت ہمیں تیرے پرستار ملے

○

مے خانہ ہے یہ، رند یہاں آتے رہیں گے
پیمانہ طلب گار مے ناب رہے گا

دریائے معاصی کی ہے گہرائی ہی کتنی
میں جب بھی اتر جاؤں یہ پایاب رہے گا

یوں عام لئے پھرتا ہے بازار میں ہر شخص
دل چھو لیا گر تم نے تو نایاب رہے گا

چاہت تری طوفاں ہے آئے گی سطح پر
موتی تو نہیں ہے کہ تہہ آب رہے گا

صحرا میں اسے تربیتِ عشق ملی ہے
دیوانہ یونہی غافلِ آداب رہے گا

○

ہے غیر میں بس ایک یہ خرابی کہ سرِ بزم
کم ظرف ہے گفتار پہ قابو نہیں رکھتا

قسمت میں ہمارے رخِ روشن کی ضیاء ہے
وہ طالع بیدار پہ قابو نہیں رکھتا

کرتا ہے خوشامد کبھی ڈر جاتا ہے یہ دل
آگے ترے، کردار پہ قابو نہیں رکھتا

غم رکھے ہوئے دل کو پریشاں بہت ہے
دل ہے کہ غمِ یار پہ قابو نہیں رکھتا

پھیلائی ہوئی روشنی سورج کی ہے لیکن
وہ سایہ اشجار پہ قابو نہیں رکھتا

دل کی تو سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے یہ بات
میں شوخ طرحدار پہ قابو نہیں رکھتا

ہے جاء تعجب کہ ہو معمار کہ مالک
وہ سایۂ دیوار پہ قابو نہیں رکھتا

تین شعر

زندگی کرنے کو کوئی آسرا بھی چاہیے
اپنی ہی تخلیق ہو لیکن خدا بھی چاہیے

خیر و شر کی جنگ میں اک انتہا بھی چاہیے
زندگی کے واسطے اک کربلا بھی چاہیے

منحصر اس کی جفاؤں پر نہیں کار جنوں
عشق کو اپنے سے اک عہدِ وفا بھی چاہیے

تخیل کا شعروں میں ہمارے جو سبب ہے
کچھ اور نہیں درد کا احساسِ طرب ہے

کل تیرے تغافل کی شکایت نہیں کی تھی
ہاں آج دل زار کا کچھ رنگ عجب ہے

کل بازو و پتوار تو مضبوط بہت تھے
طوفان کا تو زور وہی تھا کہ جو اب ہے

سر پھوڑنا پتھر سے یہی شغل ہے اس کا
ہم پیشہ ہمارا ہے ہاں فرہاد لقب ہے

وہ ترکِ تعلق تو اہم بات نہیں تھی
اے دل تری وحشت کا کوئی اور سبب ہے

بے جگہ ہیں آشفتہ سری سے در و دیوار
اس خانہ بے تاب میں وہ آیا ہی کب ہے

بنتی نہیں ہے غم سے ترے، روزگار کی
مشکل میں جان ہے دل ناکردہ کار کی

سنتے بھی ہیں جواب کے پابند بھی نہیں
ہم نے تو جان بوجھ کے غفلت شعار کی

جس نے دیا ہے ہم کو گناہوں کا حوصلہ
رکھے گا وہ ہی لاج دل شرمسار کی

نیرنگِ کائنات سے کرنا تھا انتخاب
ہم نے بناء درد محبت شعار کی

وہ آکے تیرے حسن سراپا پہ رک گئی
ایک حد کہیں تو ہونا تھی جوشِ بہار کی

بھولا ہے وہ مرے دل بے اختیار پر
اس کو خبر نہیں ہے میرے اختیار کی

○

اس کو کسی بھی چیز سے کم تر نہ جانئے
کارِ جہاں کی اصل حقیقت ہے آدمی

دنیا بھی اس کے نام ہے عقبیٰ بھی اس کے نام
دونوں جہاں کا شرفِ عنایت ہے آدمی

اس پوری کائنات میں اک قلب مضطرب
کہتے ہیں جس کو لفظ محبت ہے آدمی

وہ سرو قامتی ہے کہ بس دیکھتے رہیں
پوشاک زندگی ہے نفاست ہے آدمی

روزِ حساب و حشر بھی سب اس کے دم سے ہے
محشر میں کیا دھرا ہے قیامت ہے آدمی

☆☆

وہ فکر شب و روز میں یاد آتا ہے لیکن
یوں جیسے کوئی چیز کہیں بھول گیا ہوں

○

عقبیٰ بھی میرا میکدہ ہے — میرے بغیر اس میں کیا ہے

ایک بوند لہو کی مرتعش ہے — وہ حشر جو ہر طرف بپا ہے

کیا کہیے غریب شہر ٹھیرے — ہم کو بھی کس کا آسرا ہے

کانٹوں پہ نیند آگئی ہے — یہ جسم ہی سارا آبلہ ہے

حیرت زدہ ہے مری سماعت — کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے

وحشی سب چلے گئے شہر سے — اک رضوی تنہا رہ گیا ہے

دل تھا ہمارا یار پرانا گذر گیا
خود سے ملے ہوئے بھی زمانہ گذر گیا

پھرتے ہیں طفل ہاتھ میں پتھر لئے ہوئے
ہم نے بھی یہ سنا ہے دوانہ گذر گیا

دامن لہو سے پر کئے رہتے تھے ان دنوں
وہ عہد تھا ہمارا فسانہ گذر گیا

راہ وفا کو کرنا تھا گلنار چل پڑا
دل قطرۂ لہو تھا، نہ مانا، گذر گیا

دیوار کا تو سایہ بھی سر سے سرک گیا
رضوی تمھیں تو بیٹھے زمانہ گذر گیا

شعلہ رخ شرر مے گل و لالہ آتش
آگ تو اپنا بڑا قیمتی سرمایہ ہے

کیا ملا سال گزشتہ سے ہمیں کیا کہیے
اک نئے سال میں زندہ ہیں یہی پایا ہے

قدو گیسو کے مراحل سے کئی گزرے ہیں
دل پرخوں پہ بڑی دیر میں رنگ آیا ہے

ہم سر راہ تو بیٹھے ہیں تہی دست نہ جان
عشق ایک کیفیتِ درد گرانمایہ ہے

دل کے اندر کی تپش کا تو نہیں کوئی علاج
یوں تو اک سایہ دیوار نظر آیا ہے

رنگ ابنائے زمانہ تو وہی ہے رضوی
فائدہ کیا ہے اگر آپ کو ہوش آیا ہے

○

جب سے یہ زندگی ملی ہے ہمیں
چبھ رہا ہے غبار آنکھوں میں

آئینہ دل میں ٹوٹ جاتا ہے
کرچیوں کا شمار آنکھوں میں

بے بسی ہائے تمنا مت پوچھ
جم گیا انتظار آنکھوں میں

اک سودا ہمارے ذہن میں ہے
اور اس کا خمار آنکھوں میں

کررہا ہے پناہ گاہیں تلاش
دل افسردہ کار آنکھوں میں

آنسوں کے لیے بنی رضوی
درد کی رہگذار آنکھوں میں

○

اک پھول تعلق کا اگر کھلنا نہ چاہے
کیا زور ہمارا جو کوئی ملنا نہ چاہے

بے فیض مہارت ہے تری بخیہ گری کی
کیا کیجیے گر زخم کوئی سلنا نہ چاہے

جلتے ہوئے جسموں کا علاج اور کہاں ہے
سورج سوا نیزے سے اگر ہلنا نہ چاہے

کیوں جھوٹ وتصنع کا گناہ لیتے ہیں سر پر
کہہ دیجیے سچ دل ہی اگر ملنا نہ چاہے

اے بخیہ گرو دیکھنا پہچان یہی ہے
رضوی کا گریباں ہے اگر سلنا نہ چاہے

ڈرتے ہو اگر پیر لہو نہ ہوجائے
اس کارگہ شیشہ گراں میں کیوں آئے

کیا پیچ سمندر کی شکایت کیجیے
موجوں کے تھپیڑے سرِ ساحل کھائے

اک عمر ہوئی سوچتے شاید شب ماہ
زنداں کی سلاخوں کی طرف بھی آئے

اے لذت آوارگی شوق، سلامت
وہ سعی ناکام کہ منزل نہیں پائے

رضوی جو یہی ہونا ہے تو یہ ہی سہی
اس دل کا سرِ بزم تماشہ بن جائے

عشق کا تجربہ ضروری ہے　　ورنہ یہ زندگی ادھوری ہے

اک ترے حسن کی جھلک مل جائے　　اور یہ کائنات پوری ہے

تجربے زندگی کا چہرہ ہیں　　اور یہ چہرہ بہت ضروری ہے

عمر کی حد زمین کی گردش　　اس سے ملنے کا سال نوری ہے

عرض کیا کیجیے جنوں کا ہنر　　کارِ بےفیض و بےحضوری ہے

دیکھنے والے بہت لوگ تھے لیکن ہم نے
زخم ہی اپنے گریباں سے چھپا رکھا ہے

اسی امید پہ برداشت کی حد باقی ہے
کچھ ستم اس نے ابھی اور بچا رکھا ہے

ہم منافق تو نہیں، دل کا مگر کیا کرتے
اک بت ہم نے خدا سے بھی چھپا رکھا ہے

تری رسوائی کے ساماں بہم کرتے ہیں
ہم نے اس شغل کا ہی نام وفا رکھا ہے

بے بضاعت سہی، شامل تو چراغاں میں ہیں
اک دیا طاق میں ہم نے بھی جلا رکھا ہے

تم ہی ماہر نہیں آئینِ چمن کے رضوی
ہم نے بھی دشت کو گلزار بنا رکھا ہے

ہر دانش کا اپنا عہد ہے ہر سچائی وقتی ہے
پہلے جہاں سقراط بسا تھا وہاں اب اپنی بستی ہے

کوچہ یاراں صبح بہاراں زنداں صحرا ہاتھ آئے
ایک ہی جان تو دینا ہے دنیا کتنی سستی ہے

چال کی لہریں جسم کی خوشبو شوخ مزاجی بھیگی رو
تجھ سے بس تھوڑی ہی کم ہے یہ جو ہوا میں مستی ہے

جانے کون سی شے کم ہے یہ دل کو بھی معلوم نہیں
راتیں سوچوں میں کٹتی ہیں دن بھر آنکھ ترستی ہے

دل اس کی چاہت میں اس کی قربت ڈھونڈتا رہتا ہے
جیسے سردی کی بارش میں پہلی ٹھنڈ برستی ہے

کل بھی رچاؤ رنگ تغافل شوخی ایسی تھی رضوی
آج بھی اس کے سراپا میں کل ہی جیسی مستی ہے

لطف قد گیسو سے کچھ انکار نہیں ہے
ہاں چاک گریباں کا مزا اور ہی کچھ ہے

صحرا میں بھی تکلیف بہت ہوتی ہے لیکن
اس شہر میں جینے کی سزا اور ہی کچھ ہے

اس دست حنائی سے بھی آرام نہیں ہے
شاید دلِ پُرخوں کی جزا اور ہی کچھ ہے

انداز ہیں کچھ اور سراپا کے تمہارے
چشم ولب و عارض کی ادا اور ہی کچھ ہے

ہوگی دم عیسیٰ کی شفا بخشی کوئی بات
میرے لئے وہ دست جفا اور ہی کچھ ہے

انداز سے اپنے وہ گداگر نہیں رضوی
اس در پہ جو دیتا ہے صدا اور ہی کچھ ہے

دیوانے ہیں ہم کو کہیں آرام نہیں ہے
فرصت ہی نہیں ملتی ہے اور کام نہیں ہے

دشنام عدو طعنۂ یاراں سب ہی ہوگا
محضر میں ہمارا جو کہیں نام نہیں ہے

بیگانگی خاک سر رہ کا سبب ہے
وابستہ جو اس سے سحر و شام نہیں ہے

چلتے ہیں سوئے میکدہ فرصت ذرا ہولے
دن بھی ابھی باقی ہے ابھی شام نہیں ہے

رضوی یہی بہتر ہے کہ اب کوچ کریں ہم
کیا رہیے کہ اس شہر میں آرام نہیں ہے

○

اس چہرے پہ پلکوں کو اٹھا کر دیکھیں
پھولوں میں ستاروں کو ملا کر دیکھیں

وہ رنگ شہابی وہ رچاؤ کا بدن
اک بوسہ لب اس پر سجا کر دیکھیں

کوچہ ترا گلنار بہت پہلے سے ہے
پھر ہم ہی کیوں رہ جائیں وفا کر دیکھیں

وہ رنگ وہ خوشبو میں تراشیدہ بدن
جی چاہتا ہے ہاتھ لگا کر دیکھیں

اس طور سے رضوی اسے کیا دیکھنا ہے
پھولوں کی طرح اس کو اٹھا کر دیکھیں

○

خوش گمانئ قامت آپ پر نہیں زیبا
آپ سروقد نہیں سایہ سرو میں ہیں

خوں کی لکیروں سے منزلیں ملائی ہیں
زخم خاک آلودہ پائے راہرو میں ہیں

میکدہ کی بدنظمی ظاہراً ہے ورنہ یاں
جام ایک صف میں ہیں نشے ایک رو میں ہیں

روز و شب تسلسل ہے عکس ہائے رنگیں کا
رنگ شعلہ گل کے اک دئے کی لو میں ہیں

☆☆

کس کس راہ پہ دستک دو گے کہیں بھی آس نہ پاؤ گے
یہ جنگل سناٹے کا ہے تھک کر چپ ہو جاؤ گے

○

اس سے وفا کی آس نہیں ہم بھی کیا کریں
ایک عمر تو گذر گئی کب تک وفا کریں

بزمِ خیال کھوئی گئی کوئے یار میں
تنہائی ذہن میں بھی اب چپ رہا کریں

اے پرِ شکستگی ترا احساں اٹھایئے
پرواز کی سعی میں تماشہ بنا کریں

ایک بار مشتِ خاک سے فرصت نہیں ملی
کیسے اٹھائیں سر کو، کوئی بات کیا کریں

ہے میکدہ یہیں کہیں راہِ حرم کے بیچ
چلتے میں اک جام اگر پی لیا کریں

رضوی غریبِ شہر ہے ایسا، عجب نہیں
کوئے جنوں سے اس کے صحیفے ملا کریں

○

خیال آیا سرِ گرداب ہم کو
خدا سے ناخدا کا واسطہ کیا

عروجِ شور غوغائے ہوس ہے
صدائے پاسِ ناموسِ وفا کیا

شکستہ آئینے جڑتے نہیں ہیں
نگہ شیشہ گر کا آسرا کیا

تن مردہ اٹھائے پھر رہے ہو
دوا کیا کر سکے گی اور دعا کیا

خیالِ عارض و لب اب کہاں ہے
ہوائے زلف عنبر آشنا کیا

گذر جاتے ہیں لیجئے جاں سے ہم
اگر یہ بھی برا ہے تو بھلا کیا

دلِ پُرخوں کی کیا رنگ آشنائی
کف دست حنائی کی ادا کیا

گل و سبزہ وفا ناآشنا ہیں
غم بیگانگی ہائے صبا کیا

کروں کیا میں جگر داری کا دعویٰ
میرے صبر آزما کا حوصلہ کیا

☆☆

میں ہوں اور واماندگی شہر کا مارا یہ دل
راہ نوردی ہے تھکن ہے رہ گذر کی خاک ہے

○

مردہ تن کے لبوں پہ ہنسی ڈھونڈنا
اپنے ماضی میں کیا زندگی ڈھونڈنا

اک سورج تو کافی نہیں ہے ہمیں
اس کے چہرے کی تابندگی ڈھونڈنا

آپ کے چہرہ پہ ہم کو کچھ نہ ملا
ہم نے چاہا تو تھا دوستی، ڈھونڈنا

آدمیت کا جوہر ہے ہر اک میں
جانے مشکل ہے کیوں آدمی، ڈھونڈنا

وہ جو کل آئیں گے ان کا بھی قرض ہے
کارِ عمرِ رواں روشنی ڈھونڈنا

☆☆

دھاگے اتنے الجھ گئے ہیں اب سلجھانا مشکل ہے
ایک طریقہ باقی ہے کہ بیچ سے توڑے جائیں گے

○

خواب میں بیداری کیسی بیداری ہے
بات ہے لیکن سود و زیاں سے عاری ہے

آنکھ سے جو آنسو ٹپکا تھا سچا تھا
باقی جو کچھ ہے سب دنیا داری ہے

شغلِ مے تو جانے کب سے چھوٹ گیا
جاتے ہیں کہ پچھلی قرابت داری ہے

درد جو دل میں رہتا ہے سو جاگتے ہیں
سچ یہ ہے کہ نیند ہمیں بھی پیاری ہے

زخم کی گہرائی نشتر سے ناپو گے
اچھے مسیحا ہو اچھی دلداری ہے

دیر و حرم بے وضع ہے دنیا بے ہنگم
رضوی یہ سب بھی کارِ بیکاری ہے

○

اس دل کو ہر اک شام جو امیدِ سحر ہو
شاید کہ یہی شدت ہجراں کا اثر ہو

محرومیوں سے عشق کی شرمندہ نہیں ہم
یہ عمر دوبارہ ملے پھر یوں ہی بسر ہو

ہم تجھ کو دعا دیتے ہوئے بیٹھ گئے ہیں
اے خاک سرِ رہ ترا انجام سفر ہو

سمٹی ہوئے رنگوں میں سراپا ترا کھل جائے
پھیلی ہوئی خوشبو پہ تری راہ گذر ہو

دیکھو تو سہی حاکمو! کہتے ہیں جسے عشق
یہ جراتِ انکارِ اطاعت کا سفر ہو

کیوں زخم چھپانے کی روش ترک ہوئی ہے
دامن کو پتہ ہو یا گریباں کو خبر ہو

شانوں پہ مرے آپ پریشاں تو کریں زلف
ممکن ہے ٹھہر جائے یہ دل الٹا اثر ہو

نئے انداز سے یہ بزمِ فسوں جاری ہے
ہم رہیں یا نہ رہیں کارِ جنوں جاری ہے

سرخیِ صبح سفیدی میں بدلنا چاہے
اور شہ رگ سے ابھی رات کی خوں جاری ہے

ایک شورشِ دل مضطر میں سدا رہتی ہے
اور چہرے پہ وہی رسمِ سکوں جاری ہے

منزلیں وقت کی تقدیر نہیں ہوتی ہیں
ہر لمحہ کارِ سفر ہائے جنوں جاری ہے

اس جہاں کے لئے تکمیل کا لمحہ ہی نہیں
ایک آواز ہے کہ کن فیکوں جاری ہے

تیری چاہت تو بس ایک ہی دھارا ہے
کتنے دریا بیچ سمندر ٹھہرے ہیں

جس نے اڑنا سکھایا تھا سمجھایا تھا
اونچائی کے گھاؤ بھی اتنے گہرے ہیں

تم نے کیوں دل کی آوازیں نہیں سنی
اچھا یہ دنیا والے تو بہرے ہیں

چلیے اب سوئے مقتل ہی چلتے ہیں
کوئے جاناں میں ہر جانب پہرے ہیں

شب میں دیکھو اس کا بدن مہتابی ہے
دن میں دیکھو اس کے رنگ سنہرے ہیں

اہلِ وضع ہیں بند گریباں رکھتے ہیں
ورنہ رضوی زخم ہمارے گہرے ہیں

لطف ایسا ہے پسِ کرب کہ جی جانے ہے
منزلیں عشق کی حیراں کیئے دیتی ہیں

جانے کس سمت سے یہ گرم ہوائیں آ کر
دشت کو اور بھی ویراں کیئے دیتی ہیں

سایہ تو دھوپ سے ہے پھر بھی تری دیواریں
ہم کو منت کشِ احساں کیئے دیتی ہیں

اک تغافل ترا جینے نہیں دیتا ہم کو
اور امیدیں بھی پشیماں کیئے دیتی ہیں

جن کو سونپا تھا گریباں، وہ ہوائیں رضوی
دھجیاں اب مری پیچاں کیئے دیتی ہیں

ہر لمحہ ایک تحیّر کی فضا ہوتی ہے
چاہ کہتے ہیں جسے کیسی ادا ہوتی ہے

بن بلائے ہی چلے جائیں مگر بات یہ ہے
یوں اگر جائیں تو سبکی سی ذرا ہوتی ہے

وہ سراپا جو ہر اک سمت نظر آتا ہے
ہم کو معلوم ہے یہ بادِ صبا ہوتی ہے

کوئی مقصد ہی نہیں ہے تو توقع کیا ہو
نہ سزا ہوتی ہے کوئی نہ جزا ہوتی ہے

رات بھر وہم رہا کرتا ہے تم کو رضوی
کوئی دستک نہیں ہوتی ہے صبا ہوتی ہے

تیرے آنے کی توقع میں گلستاں دیکھیں
ہم ستاروں کی بہاریں سرِ داماں دیکھیں

روشنی رخ کی رہے باقی اندھیرا ہوجائے
کبھی یوں بھی تری زلفوں کو پریشاں دیکھیں

آمدِ فصل بہاراں ہے طرب خیز بہت
جانئے کیا رہے اب وضعِ نگاراں دیکھیں

تجربہ کیا ہے فقط عمر کی خواری کا نام
کیا ملا کھو کے ہمیں عمر گریزاں دیکھیں

آئینہ سامنے رکھ کر ترے، ہم سوچتے ہیں
تجھ کو دیکھیں کہ ترا دیدہ حیراں دیکھیں

فصل گل آئے تو وحشت کا تماشہ کرلیں
تو اگر آئے تو اندازِ گلستاں دیکھیں

میکدہ بیخودی و ہوش کا ایک سنگم ہے
اپنے ہی آپ کو پنہاں کبھی عریاں دیکھیں

مدتیں ہوگئیں ہم کو سرِ زنداں رضوی
اب رہا ہو کے چلیں کار بیاباں دیکھیں

☆☆

جس کو نہ ظرف مے کی سعادت نصیب ہو
وہ ترک مے کا مشورہ نہ دے تو کیا کرے
مجھ پہ جنوں کی پھبتیاں کستے ہو دوستو
اس خوبرو سے عشق تمہیں ہو خدا کرے

○

حسرتیں عہد جوانی کی بہت ہیں لیکن
وقت ماضی میں پلٹنے نہیں دیتا ہم کو

طربِ عشق کی خواہش بھی بہت ہے دل میں
اتنا ہی ٹوٹ کے چاہا ہے تمہارے غم کو

ہے خریدار کوئی شہر صبا کی مانند
بیچنے نکلے ہیں پیمبری عالم کو

پہلے مانگی تھیں دعائیں ہمیں مرہم مل جائے
اب دعا کرتے ہیں تاثیر ملے مرہم کو

جس نشہ میں ہیں ہم ہے اس کا تقاضہ رضوی
ٹھوکریں مار کے ہم آئے ہیں جامِ جم کو

○

احساس ذمہ داری آدابِ بزم ہے
دیوانگی تو رہتی ہے لیکن یہاں نہیں

اس شخص سے ملے ہوئے مدت گذر گئی
حالانکہ فاصلہ بھی بہت درمیاں نہیں

زانو سے سر اٹھا کے عبث دیکھتے ہو تم
اس بزم میں تمہاری کوئی داستاں نہیں

سادہ ہیں کتنے کوچہ جاناں کے لوگ بھی
سمجھے ہوئے ہیں کار جہاں درمیاں نہیں

ہم رقص وحشتوں کے بگولے بہت سے ہیں
زنداں کے بدلے رضوی بیاباں گراں نہیں

○

اجنبی چہروں پہ کیا ہو آشنا کی جستجو
گفتگو کی آبرو نہ ہو تو پھر کیا گفتگو

جام ٹکرانے کی آوازیں کہاں سے آئی ہیں
کس طرف سے آ رہی ہے رہگذار رنگ و بو

ہم نشہ میں ہوں تو ساقی چھیڑ کر پھر دیکھنا
کیا ہے مے خانہ کہاں کے جام پھر کیسا سبو

اک گناہ بے گناہی نے کیا ہے معتبر
میرے آ جانے سے ہے کنجِ قفس کی آبرو

اے مرے محبوب عنبر دست و مہتابی بدن
اے مرے جام سفال اور اے کنارے آبجو

فتنہ ہائے بے قراری کا سراپا ہے وہ جسم
آئینہ ہے جس سے لرزاں وہ بت سیماب جو

سب صحائفِ مقدس دیکھ لیجیے کھول کر
ہر ورق پہ میں ہوں رضوی اور میری ہاؤ ہو

تین شعر

سوکھے ہوئے پتوں سے ڈھکی جاتی ہیں راہیں
کیا جانئے اس سمت ہوا کیوں نہیں آتی

کھوئے ہیں کہاں قافلہ وحشتِ ہجراں
پھر کوچہ جاناں سے صدا کیوں نہیں آتی

کیوں دستِ طلبگار فضا میں نہیں اٹھتے
اب لوگوں کے ہونٹوں پہ دعا کیوں نہیں آتی

تشنہ مے سہی، رہنا سر مے خانہ ہے
ساقیا خوب وفا کا مری پیمانہ ہے

خار و دامن کی کشاکش میں یقینی یہ ہے
راستے میں ہمیں دامن سے بچھڑ جانا ہے

آئینہ خانے میں محفل تو شناساؤں کی تھی
ایک حیرت ہے کہ جو عکس ہے بیگانہ ہے

کس لیے کیجیے اب پرورش ضعف ستوں
یہ در و بام ہیں کہنہ انہیں گر جانا ہے

یہی بہتر ہے رہیں واعظ و ناصح خاموش
ان کو معلوم نہیں شہر ہی دیوانہ ہے

اپنی وحشت کے بگولوں کو صدا دو رضوی
کیسے سناٹے میں ڈوبا ہوا ویرانہ ہے

ایک کانٹا سا خراشیں ڈالتا ہو قلب پر
ایکا ایکی یوں ہو کہ انساں لہو رونے لگے

آنسوؤں کی پشت پہ دھندلا رہی ہو کائنات
اور ہر شے اپنی اپنی آبرو کھونے لگے

ڈر رہے ہوں لوگ دل پر چوٹ پڑ جائے کہیں
دھیمے لہجے میں اگر یوں گفتگو ہونے لگے

کشتگاں دل کی فصل اٹھے گی، جب آزردگی
ہر طرف دیوار و در میں سسکیاں بونے لگے

☆☆

کانٹوں سے لکیر کھینچتے ہو
پتھر نہیں ہے یہ دل ہے

حاکم سے تو ہم کو بھی بہت کام ہیں لیکن
شیوہ نہیں ہم مدح سرائی نہیں کرتے

اے شیخ مروت کا سبق سیکھ لے ہم سے
مے پیتے ہیں اور تیری برائی نہیں کرتے

انداز سمجھ میں نہیں آتے ہیں تمہارے
کہتے تو یہی ہو کہ خدائی نہیں کرتے

صیاد نے سمجھا ہو جنہیں رونقِ زنداں
وہ لوگ تو امیدِ رہائی نہیں کرتے

ہاں کہتے ہوئے رک گئے کیا خوب ہیں وہ بھی
ہوتی ہو بھلائی تو بھلائی نہیں کرتے

ایک رہزن بیچتا ہے دوسرے رہزن کے ہاتھ
قافلہ اپنا متاع دستِ گرداں ہوگیا

ہم نے جانا تھا جسے صحرائے بے دیوار و در
تنگ اتنا ہوگیا ہم پر کہ زنداں ہوگیا

دھجیاں کانٹوں سے الجھیں اور الجھ کر رہ گئیں
رہ نمائے راہ ویراں میرا داماں ہوگیا

ہم نے لکھ دی ہے تمہارے نام پہ ہر اک سانس
مرحلہ جینے کا تھا سو ایسے آساں ہوگیا

مشغلہ آوارگی کا بھی نہ راس آیا ہمیں
اک دل آشفتہ تھا وہ بھی گریزاں ہوگیا

○

سرحدیں ملکوں کی دوگام پہ آ پہنچی ہیں
پھر بھی احساسِ غریب الوطنی تازہ ہے

سیر کرنے کو جو نکلے ہو تو کھو جاؤ گے
تم کو کچھ شہرِ خرابات کا اندازہ ہے

وسعت شہر تمنا پہ تو حیراں نہ ہو
دل میں جو کچھ ہے ترے درد کا خمیازہ ہے

وہ کوئی عکس نہیں حیرت آئینہ ہے
مہ کی تجسیم ہے خورشید کا شیرازہ ہے

اک نیا گھاؤ ملا رضوی تو یاد آیا ہمیں
وہ جو پہلے سے تھا اک زخم ابھی تازہ ہے

○

شوق، امید، عشق، حیرت ہے
حسن اک دائمی مسرت ہے

اک تصور کی حسن آرائی
شعر کہنا بڑی عبادت ہے

شغل کار ہوس نہیں ہے یہ
عشق معراجِ آدمیت ہے

تیرے ہونٹوں سے ایک حرف سہی
آج دل کو بڑی ضرورت ہے

کوئی آزار نہ کسی کو ملے
یہی سب سے بڑی امانت ہے

اشک طوفاں بدست ہیں رضوی
آج شاید ہمیں فراغت ہے

○

غیرتِ عشق کا احساس رہا کرتا ہے
چاہتا ہوں میں اسے، اپنی انا سے کچھ کم

تیری یادوں کے طلسمات کے در کی مانند
رات کھلتی ہے مگر بند قبا سے کچھ کم

کوئی خوشبو سہی خوشبوئے بدن سے زیادہ
کوئی جھونکا ہی سہی بادِ صبا سے کچھ کم

عندیہ کچھ تو ملے تیری شناسائی کا
ایک آہٹ ہی ملے، تیری صدا سے کچھ کم

اس سے پہلے دلِ پُرخوں کی خبر آتی تھی
ایک دھبہ ہے وہاں رنگِ حنا سے کچھ کم

بات کرتے ہوئے رضوی سے گذرتی ہے صبا
تیرے لہجہ میں سہی تیری ادا سے کچھ کم

○

آنے کی توقع ہی نہیں اس کی ادھر کو
ایک دیدۂ حیراں کی طرح دیکھیے در کو

رہبر سے بغاوت کے تو اسباب کئی ہیں
ہم چھوڑ کے جائیں گے کہاں راہ گذر کو

وحشت کو شکایت ہے بہت تنگیٔ جا کی
ایک وسعت صحرا ہو بگولوں کے سفر کو

کیا کیجیے آشفتگی فرصت نہیں دیتی
سوچا تو بہت ہم نے سنواریں کبھی گھر کو

کیا دیکھئے اس عالمِ گذراں کی حقیقت
رفتار ہی ٹکنے نہیں دیتی ہے نظر کو

یہ سایہ گر دشتِ تمنا نہیں ہوتا
کیا دیجئے دعا آس کے بے درد شجر کو

ایک بار اداؤں سے جھجک اس کی نکل جائے
پھر دیکھئے اس شوخ کے نیرنگ دگر کو

سنتے ہیں وہاں اب کوئی رہتا نہیں رضوی
مے خانہ لئے چلتے ہیں اللہ کے گھر کو

تین شعر

یوں تو ہر شخص ترا چاہنے والا نکلا
ہدف سنگِ ستم نام ہمارا نکلا

کون پھر معرکہ دار و رسن سر کرتا
ایک دیوانہ زمانے کا سہارا نکلا

فصل گل آئی تو سب رنگ کسی اور کے تھے
درد کا ٹھیرا ہوا لمحہ ہمارا نکلا

○

ہمیں ملی نہیں فرصت کبھی ترے غم سے
کبھی سمیٹ لیا اور کبھی بکھیر دیا

ہمارے چاک گریباں کی خوب قسمت ہے
کبھی سیا کبھی وحشت ہوئی ادھیڑ دیا

ہماری کیفیتِ دل پہ اک نظر ڈالی
خدا نے کعبہ کا رخ میری سمت پھیر دیا

نجانے کون سا تہوار ہے یہ مستی کا
گلال جس نے ترے جسم پہ بکھیر دیا

☆☆

دل کا نہ کنارا نہ تمنا کی کوئی حد
وحشی کے لیے صحرا کہیں ختم نہیں ہے

○

عالم ہے اک تماشہ بازار دیکھئے
ہوتا ہے کون کس کا خریدار دیکھئے

موقع ہے سارے دیر و حرم بیچ دیجیے
ورنہ پڑے رہیں گے یہ بیکار دیکھئے

باد سموم بھی ستم ہمراہاں بھی تھا
کس کس سے پائے کون سے آزار دیکھئے

ہمت ہمارے قلب و نظر کی بھی جانئے
گہری اداسیوں کی یہ دیوار دیکھئے

کیسی ہوا چلی ہے کہ سب خاک ہے بدن
کیا زندگی گذرتی ہے بیزار دیکھئے

کار جہاں میں نہ کوئی عبرت نہ انفعال
ویراں نگاہ اور دلِ بیکار دیکھئے

دامن میں زخم چاک گریباں میں گھاؤ ہیں
رضوی سجا ہے ہم سے یہ بازار دیکھئے

تین شعر

کیوں دل کا لہو پیتا ہے یہ شجرِ تمنا
ہے دل کو شکایت یہی آئین نمو سے

نہ چاہنے دیتا ہے نہ کہتا ہے نہ چاہو
عاجز ہوئے جاتے ہیں ہم اس شوخ کی خو سے

پھر زخم کے سوزن سے چھپا لیجئے گریباں
پھر بخیہ گری جیب کی کر لیجئے لہو سے

ہمت فزا تو اس کی کوئی بھی ادا نہ تھی
حیراں ہوں کس توقع پہ کارِ وفا کیا

اک پارہ جگر کہ جو رہزن سے بچ گیا
وہ ہم نے نذر مصلحتِ رہنما کیا

تیرے ستم سے اپنی خوئے عشق نہ گئی
پانی سے کب حباب کسی نے جدا کیا

ناصح تمہارا عندیہ معلوم تھا ہمیں
کچھ ایسی بات تھی کہ تمہارا کہا کیا

یہ بات تو نہیں ہے کہ اس کو خبر نہیں
رضوی نے جان بوجھ کے سودا برا کیا

برق نگہ آنکھ کی پتلی سیاہ کرے
آئے کبھی ہماری طرف بھی خدا کرے

ہم نے تو اپنے ہاتھ دعا سے اٹھالیے
اب آرزو کوئی دلِ بے مدعا کرے

جس پہ نگاہِ شرفِ پذیرائی ہی نہیں
ایسی جبیں سے کیا ترے سجدے ادا کرے

اک استعارہ اس کی جفا ہے جفا نہیں
اک اصطلاحِ عشق ہے وہ قتل کیا کرے

وہ آرزوئے عہد نمو کا ہے رازداں
جو شخص زرگلِ کو گلستاں کہا کرے

ہم کو نہیں ہے شعر سنانے کا بھی دماغ
اور اس کی آرزو کہ قصیدے کہا کرے

رضوی اگر لگاؤ نہیں ہم سے کچھ اسے
دل بیقراری ہائے تمنا کا کیا کرے

شدت نے موسموں کی بدن توڑ دیا ہے
دیکر مجھے صدیوں کی تھکن توڑ دیا ہے

تعزیر کی اک نئی رسم تم سے چلی ہے
اور ہم نے بھی وہ کہنہ بدن توڑ دیا ہے

اے باد صبا کس نے سرِ شاخ چمن سے
وہ جھونکا جو تھا روح چمن توڑ دیا ہے

اس طور پکارے ہے کوئے یار کہ ہم نے
واماندگیٔ جاں کا چلن توڑ دیا ہے

جس لمحہ پہ قاتل کو مرے ناز بہت تھا
وہ لمحہ سردار و رسن توڑ دیا ہے

رنگوں سے کہکشاں کے ہے دامن بھرا ہوا
اے کائنات میں نے ترا حسن چھو لیا

کیا کیا لیا ہے تجھ سے زمانے نے مستعار
شوخی نظر کی مانگی رم گفتگو لیا

راہوں کی سختیاں تو مرا جزوِ عشق ہیں
کانٹا اگر گرا کوئی پھر سے چبھو لیا

آنکھیں کھلیں تو علم ہوا شام ہوگئی
افسوس ہو رہا ہے بہت دیر سو لیا

اس ہاؤ ہو میں ساقی کو بھی ہوش نہ رہا
کس نے اٹھایا جام تو کس نے سبو لیا

رضوی ہماری شہر میں قیمت نہیں مگر
لوگوں نے ہم سے دردِ وضع آبرو لیا

طلب شعلہ وصال کے نام
زندگی عشق کے مال کے نام

ہم فقیروں کی آرزو ہی کیا
لاج رکھ عزتِ سوال کے نام

ہم ہیں سرشارِ آرزوئے نشاط
رہنِ امید ماہ و سال کے نام

صفِ عشاق پہ ہوا ہے قرض
ایک تحفہ ترے جمال کے نام

دور اک بزم سج رہی ہوگی
مرے عشقِ جنوں خصال کے نام

شب کا آخر پہر ہوا اے دوست
ایک بوسہ ترے خیال کے نام

تنہائی بدگمانیوں کا کاروبار ہے
بہتر یہی ہے لوگوں سے ملتے رہا کرو

تم کو اگر تلاش کسی کج کلاہ کی ہے
تو آ کے ہم فقیروں کے دستک دیا کرو

تم کو نہ تھا خلوص نباہنے کا حوصلہ
کس نے کہا تھا تم سے کہ کارِ وفا کرو

ہر ایک کو غرورِ خود آرائی ہے بہت
تم تو غریب شہر ہو تم چپ رہا کرو

آوارگیٔ عشق ہے اک کار معتبر
صحرا ملے تو اس کو گلستاں کیا کرو

رضوی عجیب لگتا ہے جنت کا یہ خیال
بے کار بیٹھو کام نہ کوئی کیا کرو

○

عمر بھر دل کو بے قرار کیا — ہم نے تا دیر انتظار کیا
اپنا ہی اعتبار کھو آئے — اور تو سب کا اعتبار کیا
خاک اڑاتا پھرے ہے صحرا میں — کیسے وحشی کا اعتبار کیا
کائنات آدمی کی دلہن ہے — جتنا چاہا اسے سنگھار کیا
ایک آشفتگی مزاج میں تھی — ٹوٹ کے ورنہ ہم نے پیار کیا
خاک کا ایک بگولہ سا ہے — جس نے افلاک شرمسار کیا
میر کے احترام میں رضوی — نذر کا ہم نے یہ شعار کیا

○

دل زندہ کے امتحاں کے لئے — ہم نے سب دردوغم جہاں کے لئے
اے رم آہوئے خرام ناز — اک قدم اور لامکاں کے لئے
ناز، تسکینِ دل وحشی کو — کج ادائی ہے امتحاں کے لئے
عشق میں یہ ہی ہوا کرتا ہے — دشت ہیں پائے ناتواں کے لئے
خاک میں خوار ہوگیا ہے آج — کیا بنایا تھا آسماں کے لئے
بے یقینی پہ استوار یقیں — وہ بھی مجھ جیسے بدگماں کے لئے
اے تخیل نواز ہم بھی ہیں — کچھ وسعت دے ہمیں بیاں کے لئے
اتنے تھوڑے نشہ میں اے رضوی — آپ چل نکلے ہیں کہاں کے لئے

○

ہر ایک سمت ہیں رقصاں ترے جمال کے رنگ
کہیں پہ ہجر کے رنگ اور کہیں وصال کے رنگ

وہ ساعتیں جو ترے نام پہ لکھیں ہم نے
تمام عمر رہیں اپنے ماہ و سال کے رنگ

جواب کوئی بھی دے نہ سکا زمانہ مجھے
الگ نہیں تھے لہو سے مرے سوال کے رنگ

ہے تیرے حسن کا پرتو اور عالم آئینہ
حقیقتوں میں بسے ہیں ترے خیال کے رنگ

کہاں کہاں مری وابستگی نہیں تجھ سے
مرے عروج کے قصے مرے زوال کے رنگ

کہاں سے گیسوئے عنبر شمیم آئی ہے
کہاں سے آئے ہیں عارض پہ یہ گلال کے رنگ

عجب طلسم کدہ موج اضطراب ہجر
عجیب حیرتِ شوقِ جنوں وصال کے رنگ

☆☆

دل نے ہر چند سہے عشق میں آزار بہت
پھر بھی ہر لمحہ ہیں پہلوئے غم یار بہت
اس سراپا پہ نظر کیجئے تو کھلتا ہے
اک انکار میں پوشیدہ ہیں اقرار بہت

حیراں کیے دیتی ہے عارض کی یہ سرخی
کیا کہیے کہ اس رنگ کی تشبیہ نہیں ہے

کچھ حسن کا منت کش احساں نہیں عشق
میں اور کہیں ہوتا ہوں وہ اور کہیں ہے

ایک عمر زیاں کار سے شرمندہ ہے یہ دل
اک سجدہ بے فیض سے نادم یہ جبیں ہے

کچھ ایسی دکھن ہے کہ کمی ہی نہیں ہوتی
آزار غم عشق کا وہیں داغ وہیں ہے

ہے مرحلہ وہم و گماں خواب کا اک کھیل
دانش جسے کہتے ہیں تماشائے یقیں ہے

احباب سے ملنے کی توقع ہی عبث ہے
رضوی کی خود اپنے سے ملاقات نہیں ہے

وہ سنگ سرراہ مرا زادِ سفر تھے
جو منت طفلاں تھے لہو سے مرے تر تھے

کیا ہو گلہ، تشنہ لبی آج کہ ہم لوگ
کل بھی یہی صورت تھی یہ بے آب نگر تھے

سیلاب نے مجبور کیا ترکِ وطن کو
اب اس کا نشاں بھی نہیں جس بستی میں گھر تھے

نہ کار جہاں سلجھا نہ وہ زلفِ پریشاں
سب صرف کیئے ہم نے ہمارے جو ہنر تھے

ہم اپنے درو بام سے شرمندہ رہے ہیں
اس شہر میں سب لوگ ابھی خاک بسر تھے

اس نسل سے شکوہ کوئی زیبا نہیں رضوی
کل ہم بھی یونہی باغی تھے اور اہلِ نظر تھے

رہن مے کردی صرف غم کردی
تم سے امید کرم کم کردی

بن گئی صحرا ایک مشتِ خاک
ہم نے کیا داستاں رقم کردی

اپنے جام سفال سے تحریر
ہم نے تاریخ جامِ جم کردی

خواہشوں کا حساب کون کرے
زیست وقف رم صنم کردی

لوح پہ لکھ کے اتنے دکھ تو نے
آبروئے قلم ہی کم کردی

سخت آزار ہے دنیا رضوی
بوجھ وہ ہے کہ کمر خم کردی

لطفِ باراں ہے جو شعلہ سا بدن بھیگا ہو
جام مے بھیگا ہو اور رنگِ چمن بھیگا ہو

رنگ دکھلا رہی ہو صحن گلستاں میں پھوار
میرا من بھیگ رہا ہو ترا تن بھیگا ہو

لب ترے ایسے چھوئیں قطرۂ ابرنیساں
دہنِ غنچہ لالہ و سمن بھیگا ہو

سبزہ و گل پہ اڑاتی ہوئی چھینٹے نکلے
مے برستی ہو، ہواؤں کا چلن بھیگا ہو

اوج انساں پہ ستاروں کی پھواریں جیسے
یہ دعا ہے مرے فنکار کا فن بھیگا ہو

اسکے ماتھے سے اترتی ہوئی افشاں برسے
رات ہوتی ہو مرے گھر کا صحن بھیگا ہو

عنبریں زلف کی خوشبو، رخ مہتاب کا نور
فکر بھی بھیگی ہو رضوی کا سخن بھیگا ہو

کیا جانے شب کب آئی کدھر کو سحر گئی
اپنی تو عمر کارِ وفا میں گذر گئی

کچھ صرفِ محتسب ہوئی کچھ نذرِ کوئے یار
ایک بوند تھی لہو کی بڑا کام کر گئی

کتنے دکھوں کے ساتھ تھی مگر معتبر بھی تھی
وہ رات جو سحر کو جنم دے کے مر گئی

اک بیکراں اتھاہ سمندر ہے عشقِ یار
اک موجِ وصل و ہجر کہ آئی، گذر گئی

کس شے سے بنی ہے بے قراری
آخر یہ اضطراب کیا ہے

کیوں اس کا انتظار کیجئے
یہ بے خودی خواب کیا ہے

چل دوں کہ اس کی راہ دیکھوں
اے دل ترا جواب کیا ہے

گر مے نہیں پی ثواب کیسا
اچھا پی لی، عذاب کیا ہے

کیا شے ہے شیخ کی بردباری
اور مستیِ شراب کیا ہے

مابین وجود اور عدم کے
جب کچھ نہیں تو سراب کیا ہے

پانی میں کون سی تڑپ ہے
پھر آرزوئے حباب کیا ہے

ہر روز حساب دے رہا ہوں
رضوی روزِ حساب کیا ہے

☆☆

اک منزل کی سمت سارے قدم
راستہ دھوپ گرد سایہ ہم
بے وزن روح بے یقیں سا جسم
کن خلاؤں میں تیرتے ہیں ہم

○

اک لطف جُہد ابتلا کا ہم لے رہے ہیں مزا وفا کا
کھاتا ہے عصر کی قسم وہ یہ اعتبار ہے خدا کا
درویش کے لیے ہے معمول واپس آنا اس کی صدا کا
وہ پُراسرار مسکراہٹ کیا ہے جواب اس ادا کا
آنے تو دو اسے یاد میری غصہ ہی کیا ہے اس خفا کا
رضوی چراغ کا کیا کرو گے جھونکا ہوگا اگر ہوا کا

○

یہ اُجالا میرے دماغ کا
ہے ذہن میں عکس چراغ کا

مجھے ساری دنیا سے کیا غرض
کوئی ایک گوشہ ہو باغ کا

جہاں دل میں زخم ہیں گھاؤ ہیں
یہاں کب گمان تھا داغ کا

یہ جو شکل شیشۂ مے کی ہے
یہ غرور ہے اس ایاغ کا

نہ تلاش اپنے وجود کی
نہ گماں تیرے سراغ کا

غم دو جہاں کو بھی دیکھنا
ہو جو اک لمحہ فراغ کا

جمع رکھ کے رضوی کرو گے کیا
زر و سیم سینۂ داغ کا

☆☆

یہ آندھی ریت کی سر سے گذر گئی لیکن
ہوا پہ لوگوں کا پھر اعتبار جاتا رہا
سمندروں سے مری کشمکش پرانی ہے
وہ گھر مٹاتا رہا اور میں گھر بناتا رہا

○

نفرت کے واسطے تو یہ دنیا بنی نہیں
ہیں وجہ اختلاف وجہ دشمنی نہیں

لے آؤ جس کو بار الم نہ قبول ہو
آزردگانِ دل کی یہاں پر کمی نہیں

اک جان دینا ہے سو تمہارے لئے سہی
بے فیض زندگی تو کوئی زندگی نہیں

لے کر تمہیں نکل چلیں ہم کائنات کو
اور شرط یہ سفر کی ہو کہ واپسی نہیں

نہ لذت گنہ ہے نہ ہے نشاط مرگ
ہم کو قبول خضر کی سی زندگی نہیں

اپنی اداسیاں بھی اسی کے سبب سے ہیں
بے ذکر دوست لذت آزردگی نہیں

رضوی لباس شعر عروض سخن سہی
عنصر نہ فکر کا ہو تو پھر روشنی نہیں

☆☆

جو آرزو نکل نہ سکی زخم بن گئی
جو پھول کھل نہ پائے وہی خار ہوگئے
اے شوقِ مضطرب یہ تماشا بھی دیکھنا
ہم آپ اپنی راہ میں دیوار ہوگئے

راہ پر خار تمنا تو کہیں ختم نہیں
دل زدہ اور سہی آبلہ پا اور سہی

وسعتِ دشت میں کچھ اور اضافہ کر دے
کچھ خمارِ دلِ وحشی کا صلہ اور سہی

ہمیں فریاد سنے جانے سے ہے صرف غرض
سننے والا ہو کوئی اور خدا اور سہی

نقشہ شہر بنایا ہے جنوں نے میرے
اس کی تعمیر میں اک تیری ادا اور سہی

عشق جس نے نہ کیا ہو نہ سمجھ پائے گا
قبلہ کچھ اور سہی قبلہ نما اور سہی

رضوی ہو جائے اگر میرا سفینہ غرقاب
مر کے ساحل پہ ملوں اک دعا اور سہی

کچھ غمِ دل کا مداوا نہیں کرنے پائے
ہم نے چاہا تو بہت زخم نہ بھرنے پائے

رسمِ تعزیر کا انداز نیا ہے تیرا
زندہ رہ پائے نہ یہ شخص نہ مرنے پائے

اور بگڑا ہی چلا جاتا ہے کارِ دنیا
اس کے گیسو پریشاں نہ سنورنے پائے

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں تو کچھ اور نہیں
اک رگِ جاں کا لہو ہے گر ابلنے پائے

روشنی چشمِ فسوں ساز کے احساں کی ہے
کچھ ستارے جو مرے دل میں اترنے پائے

رضوی ہم اتنا حقائق کو لہو دے آئے
دیکھنا اب کے نہ یہ خواب بکھرنے پائے

عمر گذری ادائیگی کرتے   اور ہے قرضِ تمنا باقی
مر گیا تھا جو ایک دیوانہ   سرِ بازار تماشہ باقی
اضطرابِ حیات ختم نہیں   نیا لمحہ نئی دنیا باقی
ختم ہوئیں سب کہانیاں اپنی   رہ گیا ہے دل رسوا باقی
رونقِ بزم سب ان ہی سے ہے   رکھیے احباب و آشنا باقی
دل کی آبادیوں میں اے رضوی   رہے درویش کی صدا باقی

الفاظ، قلب و ذہن کی حرمت ہیں اور شعر
الفاظ کی رگوں سے لہو کی کشید ہے

ایسا بھی مرنے والا ایک انسان چاہیے
ہر شخص کہہ اٹھے یہ ہمارا شہید ہے

ہے کار گاہِ عشق پہ دنیا کا انحصار
فکرِ وفا ہی امنِ جہاں کی نوید ہے

لاچارگی ہماری بھی اب اک مثال ہے
اے اہلِ کوفہ تم سے وفا کی امید ہے

مشہور ہیں تمہاری تلون مزاجیاں
وہ بات کون سی ہے جو تم سے بعید ہے

رضوی سوال چوں و چرا تیرا بس نہیں
تُو تو عزیز اپنے یقیں کا مرید ہے

سب رنج و ملال ہیں گوارا   اے زیست غم ناروا نہ دینا
ہے لطف تھوڑی تشنہ کامی   اس شب رہِ میکدہ نہ دینا
دیکھو اسے جفا جو نہ کہنا   ہم کو دادِ وفا نہ دینا
زخموں کی نہیں ہے ہم کو پرواہ   مرنے کی ہمیں دعا نہ دینا
ایک زخم دوستانہ نہ ہو   اک رنج آشنا نہ دینا
ہم قصہ ہجر کہہ رہے ہیں   دیکھو تم مسکرا نہ دینا
وہ جرم جس کی سزا نہیں ہے   اس جرم کی سزا نہ دینا
دیوانگی ہے اس کی رونق   رضوی کو تم اٹھا نہ دینا

نہ جانے کیا ہے زمانہ کہیں قیام نہیں
کسی جہت میں کوئی آخری مقام نہیں

عجیب بات ہے کہ میرے قتل نامہ پر
کسی کی مہر نہیں ہے کسی کا نام نہیں

یہ دائرہ ہے سرِ آب پھیلتا جائے
حدیں جنوں کی ترے حسن پر تمام نہیں

طلب میں مے کی در میکدہ پہ آ بیٹھے
خیال ہی نہیں آیا ابھی کہ شام نہیں

گذر ہی جائے گی جیسی بری بھلی گزرے
گلہ نہیں ہے کسی سے کوئی کلام نہیں

کبھی تو کارِ جہاں بھی عذاب ہوتا ہے
تمہارا ساتھ نہیں مے نہیں ہے شام نہیں

بدل گئیں وہاں رسمیں کدھر چلے رضوی
تمہارا کوچہ جاناں میں کوئی کام نہیں

○

وابستہ ہوگئے ہیں نئے روزگار سے
فرصت نہیں ہے ہم کو ترے انتظار سے

ااک جسم ہے کہ جیسے پھواریں بہار کی
ایک نام ہے کہ رنگ ہیں سب آبشار سے

ہر ذرہ ایک پر تو حسن خیال ہے
اور منعکس خیال رخ عکس یار سے

کیا فائدہ ملے گا اسے اس فریب سے
میٹھی زباں ناصح کی ہے تیرے پیار سے

شعروں میں کچھ صباحتیں اس کی لے آیئے
رضوی اٹھائیں فائدہ اس کے نکھار سے

☆☆

حاصل عمر تھا وہ لمحہ گریزاں ہی سہی
جب تجھے دیکھا تھا چاہا تھا، تمنا کی تھی

○

کون لائے سفر دشت تمنا کی خبر
حوصلہ چاہیے تفسیر غم جاناں کو

سایہ پڑتا سلاخوں کا جو دیواروں پر
ایک زنداں ہے نصیب اور مرے زنداں کو

ایک مجموعہ اضداد ہے فطرت اس کی
جانے کس چیز سے تخلیق کیا انساں کو

دیکھ لو سنگ ملامت کا ذخیرہ اپنا
جھاڑے دیتے ہیں سر راہگذر داماں کو

بند کیے لیتے ہیں ہم چاک گریباں اپنا
تہہ کیے لیتے ہیں ہم اپنے سرِ داماں کو

اک مدت سے تھا آشفتہ وہ کس سمت گیا
ڈھونڈنے نکلے ہیں ہم آج دلِ ویراں کو

اک لمحہ میں گذر جائیں گی صدیاں رضوی
برق کے دوش پہ کرنا ہے سفر انساں کو

تین شعر

تاروں کی طرح رات کے دل میں اتر گئے
کیا لوگ تھے جو عہد ستم سے گذر گئے

اک اک قدم کا دینا پڑے گا انہیں حساب
میرے لہو سے لوگ اگر بے خبر گئے

نیرنگیِ سیاست مے خانہ خوب ہے
ساقی کے نام تھے جو گنہ میرے سر گئے

☆☆

کانٹے جھاڑی کوڑا کرکٹ روک رہا ہے کنارے کو
باڑھ ندی میں آئے گی تو سب کا سب بہہ جائے گا
بستی والوں سے چپکے سے کہتی ہوئی گزری ہے ہوا
بند نہ کرنا دروازے اک تھکا مسافر آئے گا

آج کی قدروں سے گر میل نہیں پاؤ گے
کل کی قدروں کو جو دیکھو گے تو مر جاؤ گے

یہی بہتر ہے کہ مے خانہ کے در پہ بیٹھو
شہر سنسان ہوا اب کہاں گھر جاؤ گے

زندگی ہمت مردانہ کی توقیر سے ہے
ڈوب ہی جاؤ گے یا پار اتر جاؤ گے

رنگِ گل شعلہ مے سرخی عارض و لہو
اپنے دامن میں لئے کتنے شرر جاؤ گے

ایک دفعہ اس کی محبت میں اتر کر دیکھو
آگ کا دریا ہے کندن سا نکھر جاؤ گے

دشت والوں نے یہ کہلایا ہے تم کو رضوی
تم اگر دشت نہ آئے تو کدھر جاؤ گے

آسمانوں کا زمیں سے معاملہ درپیش ہے
فیصلہ ہوجائے گا وہ مرحلہ درپیش ہے

راہ و منزل کی خبر ہے اور نہ کوئی زادِ راہ
اے خس وخاشاک طوفاں کی ہوا درپیش ہے

اور کسی کو کیا کوئی الزام دے پاتے کہ ہم
خود لکھی ہے نام پر اپنے سزا درپیش ہے

منزل دار و رسن سے کوئے جاناں تک سفر
کس قیامت کی ہمیں یہ ابتلا درپیش ہے

وہ ہوائے گلستاں ہے نہ گل رنگ بہار
عندلیبِ شوق کو اپنی نوا درپیش ہے

دیکھیے کب تک پلٹ کر آئے گا کوئی اثر
کار مابین مسیحا و خدا درپیش ہے

فکر چارہ سازی ہم نے کی نہیں معلوم تھا
ہم کو رضوی ایک دردِ لا دوا درپیش ہے

اور کوئی ہوتا اس سے جھگڑا کرتے
اپنے لہو کی سازش کو ہم کیا کرتے

بے وجہ سب رشتوں کو مضبوط کیا
بہتر تھا کار دنیا تنہا کرتے

کب اس چاہ میں دیوانہ پن لازم تھا
اچھا لگتا ہے خود کو رسوا کرتے

ہر لمحہ ہیں شہروں میں آزار بہت
جا نہ بستے صحرا میں تو کیا کرتے

دور کہیں افلاک پہ اپنا گھر ہوتا
ایک تماشہ ہوتا ہم دیکھا کرتے

چاہا تھا کہ قرض ہمارے واپس ہوں
سوچا تھا کہ ہم بھی قرض ادا کرتے

رضوی ضائع ہوئی سعی افسوس ہوا
ہار گئے تو کیا ترکِ دنیا کرتے

○

پرنیاں سی نرمی ہے سوز سی گھلاوٹ ہے
انبساطِ عشق میں جانے کس کی آہٹ ہے

مہر و ماہ کی کرنیں جگنو اور ستارے ہیں
نیلی جھیل آنکھوں میں کیسی جھلملاہٹ ہے

جیسے تختۂ گل میں کونپلوں کا ملنا ہے
یا صبا میں آنچل کی اس کے سرسراہٹ ہے

جیسے لالہ و گل کے رنگ مسکرائے ہیں
دھوپ سے اس عارض پہ ایسی تمتماہٹ ہے

کچھ عجب طلسم ہے جو کھلتے کھلتے رک جائے
اس کے شوخ چہرے پہ ایسی مسکراہٹ ہے

وہ اگر نہیں آیا رضوی اور کون ہوگا
دھیرے دھیرے چلنے کی دل میں ایک آہٹ ہے

○

بند کوئے قاتل ہے اور درِ مسیحا بھی
جاؤ گے کہاں اپنا دردِ بے اماں لے کر

کوئی بات تو ہوگی جس کی پردہ داری ہے
پھر رہے ہو بستی میں میری داستاں لے کر

ایک قلب سوزی ہے ایک جسم سوزی ہے
کیا صلہ ملا ہم کو کارِ دو جہاں لے کر

سارا شہر نالاں ہے سارا دشت شاکی ہے
اک یہ دلِ وحشی جائیں ہم کہاں لے کر

کچھ پتہ نہیں چلتا دیر کیا حرم کیا ہے
وہم لے کے نکلے تھے آ گئے گماں لے کر

ایک شہر قاتل ہے ایک شہر ناصح ہے
سب نے آزمایا ہے ہم کو امتحاں لے کر

چند حرف ہیں رضوی شاعری کا سرمایہ
آ گئے ہیں محفل میں ہم ترا بیاں لے کر

☆☆

دوستو سایۂ دیوار سے آگے تو بڑھو
وہ کڑی دھوپ ہے زنجیر پگھل جائے گی

☆☆

پرواز اختیار نمو کا تھا تجربہ
تخلیق کی تھی میں نے ہی پروردگار کی

○

حدیثِ دوست ہو سننا اگر تو ہم سے سنو
خمارِ لب سے سنو شوخیِ قلم سے سنو

وصال و ہجر کے رمز اور کوئی کیا جانے
ہمارے عشق کے قصے اسی صنم سے سنو

ہماری بات تو جامِ سفال سے پوچھو
جو داستان کے وجم ہے جامِ جم سے سنو

کہاں سے لائے غزالاں یہ بے خودی کا غرور
یہ ان کی شوخی سے پوچھو یہ ان کے رم سے سنو

بہار آبلہ پائی کا دور ہے رضوی
کہانی لالہ و گل کی رہ ستم سے سنو

○

میکدہ اک رشتۂ لمس متاعِ گرداں ہے
فرق کیا ہے درمیاں اجنبی و آشنا

آشنا ہے جاں کا دشمن اور ہم مجبور ہیں
ساتھ لے کر پھر رہے ہیں زندگی و آشنا

اے دلِ آفت زدہ کیا عافیت کی داد ہے
اجتماع ضدیں کا ہے آشتی و آشنا

اپنی نادانی تھی دونوں کو الگ سمجھے تھے ہم
لازم و ملزوم دونوں گمرہی و آشنا

روز و شب ہم نے گزارے رضوی اس امید پہ
ہوں بہم اے کاش اک دن یکسوئی و آشنا

○

رکا ہے وقت ترے انتظار میں کب سے
کبھی یہ گیسو بڑی دیر میں سنورتے ہیں

یہ خاک بیٹھے کہیں راہ صاف ہو تو چلیں
ابھی تو گرد کے طوفاں بہت گزرتے ہیں

یہ نقشِ لمحہ موجود کا تقاضا ہے
کبھی لہو کبھی اشکوں سے رنگ بھرتے ہیں

نہیں ہے شہر زلیخا کوئے صبا لیکن
سنا ہے اب بھی پیمبر وہیں اترتے ہیں

خوشا بہار چمن زار و فرش لالہ و گل
گلوں کے رنگ میں نغمے یہاں سنورتے ہیں

کچھ ہم سے زیادہ ہے احساس تشنہ کامی تمہیں
تمہارے نام پہ ایک اور جام بھرتے ہیں

ہماری بات سنی جا رہی ہے پیشِ جنوں
ہمارے ہاتھ گریباں پہ ناز کرتے ہیں

ہمیں بھی علم ہے رضوی کہ اہل وضع شہر
ہمارے چاک گریباں پہ ناز کرتے ہیں

☆☆

آبلہ پائی کا چلن ان کا
اور یہ رنگیں دیار ہے سب کا

زحمت مے کشیدنی ان کی
اور مے کا خمار ہے سب کا

اک نیا چہرہ ان سے مانگے ہے
وقت جو اعتبار ہے سب کا

○

آنکھوں کی پتلی ٹھیرا ہے نطق و لب کا مان ہوا
جس نے عزت رکھنی سیکھی بس وہ ہی انسان ہوا

دل کا کاروبار کیا تھا ہم نے بھی مجنوں نے بھی
اس نے نفع میں شہرت پائی اور ہم کو نقصان ہوا

دشت وبیاباں کا ہنگامہ صحن چمن کی گل باری
ایک تماشہ میرے لئے خود میری ہی پہچان ہوا

کفر اسے کہتے ہیں جس پر سارا ایماں ناز کرے
وہ جو غرورِ کفر ہوجائے بس وہ ہی ایمان ہوا

ہیرے تراشے ہیں کوئلہ سے یہی صفت آتی ہے
جس مصرع کو ہم نے چھوا وہ ہیرے کی کان ہوا

رضوی ہم نے صحرا میں اک نخل سے یاری رکھی تھی
اب کے خزاں کے موسم میں وہ رشتہ بھی بے جان ہوا

24-3-96

دل یک ذرہ شش جہت ہو جہاں — وسعتِ کائنات کیا کہیے

اس تجاہل کو کہیئے پُرکاری — اس تغافل کو آشنا کہیے

ہاتھ آجائے تو صنم کہیے — ہاتھ نہ آئے تو خدا کہیے

خاک شکلیں بدلتی رہتی ہے — کیا بقا کہیئے کیا فنا کہیے

اپنا عزمِ سفر سلامت ہو — جنگلوں کو بھی راستہ کہیے

گر کہیں جبرئیل مل جائیں — خیریت پوچھیے دعا کہیے

چاک کیجیے اگر گریباں کو — اس تماشے کو بھی وفا کہیے

درد اور درد مشترک وہ بھی — غیر بھی ہو تو آشنا کہیے

وقت ادا ناشناس ہوتا ہے — ناروا کہیئے یا روا کہیے

وہ بے چارہ کب اپنے ہوش میں ہے — آپ رضوی کو کیوں برا کہیے

ہم نے رفاقت غم جاناں شعار کی — آگے کی منزلیں تھیں غمِ روزگار کی

موجِ خرام باد صبا دلفریب ہے — سبزہ پہ لہر لیتی ہے ناگن بہار کی

گل عندلیب باد صبا آبجو خموش — ہر شے میں کیفیت ہے ترے انتظار کی

غمخواری جنوں کے تقاضوں کو کیا کریں — فطرت بدل گئی مرے غفلت شعار کی

زنگار آئینہ کی شکایت بجا نہیں — ہر شے کی قدر ہوتی ہے اک اعتبار کی

انساں دوستی کے نوا سنج صوفیوں — تم ایک بازگشت ہو میری پکار کی

واماندگی راہ کا ایک ہی علاج ہے — اک مشت خاک سر پہ مرے رہ گذار کی

رضوی خرامِ ابر بہاری کے ساتھ ہے — خنکی و تازگی و ہوا مرغزار کی

کرب ساری عمر کا دارو رسن سے بیش ہے
بندشِ لب، سب عذاب جان وتن سے بیش ہے

دل ہے اور جلوہ گہ نیرنگئ نازِ خیال
یہ وہ خلوت ہے جو تیری انجمن سے بیش ہے

کیوں اڑاتے ہو مذاقِ وحشتِ آزردگی
یہ دل آزاری رگِ جاں کے چلن سے بیش ہے

چاندنی مہکار رنگت اور پس منظر میں زلف
دولتِ نظارگی شرحِ بدن سے بیش ہے

کتنی کلیوں کا نکھار اور کتنے پھولوں کی بہار
رنگ اس عارض کا رضوی کے سخن سے بیش ہے

لوگ وہ مقابل تھے جان بوجھ کر ہم نے
ہارنا ہی سیکھا تھا جیتنا نہیں آیا

جس کا فیض ہی نہ ہو اس ہنر سے کیا حاصل
جس میں برگ وگل نہ ہو اس شجر کا کیا سایہ

خلد سے نکلنے کی گو خوشی نہیں ہم کو
پھل مگر زمینوں کا کچھ لذیذ تر پایا

جل اٹھے دیئے لیکن جسم راکھ ہو بیٹھا
راگ ہم نے دیپک کا شعر گوئی میں گایا

زندگی کی شاہراہ پر عمر بھر یہی دیکھا
ایک راستہ نکلا ایک راستہ آیا

موج سر پہ آئی ہے تحفہ ہے سمندر کا
ریت سے بھرو دامن ساحلوں کا سرمایہ

نازشِ بہاراں کی آج آمد آمد ہے
نکہت آشیاں کیجیے سایہ لائے گل کا

کشت کی شکایت کیا ہم نے کیا کیا رضوی
فصل سنگ بوئی تھی اور زخمِ سرپایا

☆☆

ملے جو عمر گزشتہ تو کیا بسر کیجیے
کہ ماہ و سال پہ اک رنگ ہے ملال کا سا
کھلی ہوئی تھی جو یادوں کی چاندنی رضوی
شب فراق پہ دھوکہ رہا وصال کا سا

○

اس کے ہونٹوں کے دو کناروں بیچ
کتنے خم کس قدر نشیب و فراز

بات کرتی ہو پھول سے شبنم
مسکراتی ہو جس طرح آواز

اس کے آنچل میں موتیے کی مہک
اس کی بانہوں میں زندگی کا گداز

ایک غرورِ جمال خود آرا
ایک شوق سپردگی انداز

وحشت آہوئے خرام تیز
ڈار سے بچھڑی کونج کا انداز

دل ہے محشر گہ قد وگیسو
جاں ہے وقف نزاکت ہائے ناز

راگنی بولتی ہے آہٹ میں
اس کی پائل ہے کائنات کا ساز

وہ سراپا طلسم پیچ و خم
چشم و لب کتنے زاویوں کے راز

حسن جیسے تلاوتِ رحمان
صوت جیسے بہار کی آواز

وہ شکن ہائے چتون و ابرو
وہ خم پیچ و تاب زلف دراز

خم گردن میں استعجاب نہاں
جھولتی باہنیں بے نیاز انداز

آتش خنک پنبہ برفاب
خنکی قعر آتشیں درباز

○

اوہام بھی زیادہ ہیں حکایات بہت ہیں
بے وجہ بھی اس دل کو شکایات بہت ہیں

کیا شکوہ بے مہری حسن ہو کہ خبر ہے
اس کو بھی عزیز اپنے مفادات بہت ہیں

نادیدہ ہے جو گرد نظر میں نہیں جو خار
اس راہ میں ہم پر یہ عنایات بہت ہیں

ٹوٹے ہوئے شیشے کی طرح چبھتے رہے ہیں
ہے عمر تو کم اور یہ لمحات بہت ہیں

مقتل ہو کوئے یار ہو صحرا ہو چمن ہو
دل کے لیے سامانِ مدارات بہت ہیں

شفاف ہے زنگار ہے کچھ جھوٹ ہے کچھ سچ
آئینہ کے اپنے ہی تضادات بہت ہیں

اوروں سے شکایات کی فرصت نہیں ہوتی
رضوی کے لیے اپنے ہی حالات بہت ہیں

آندھی میں ترس گیا ہوا کو
دیتا ہوں دعائیں میں خدا کو

یہ خاک خود ہی در بدر ہے
الزام نہ دیجیے صبا کو

اس اضطراب آرزو میں
ملتا نہیں سکوں وفا کو

پھرتی ہے لئے کہاں خرابی
اک برگِ زرد کی صدا کو

خاموشیوں کی بازگشت ہے
لے جاؤں کہاں میں اس نوا کو

کچھ تازہ زخم لائے رضوی
جب ڈھونڈنے چلے دوا کو

زینتِ سر ہے خاکِ پائے حسین
میں کہاں اور کہاں ثنائے حسین

اے خدا ہم تیری اجازت سے
ایک سجدہ کریں برائے حسین

کیا جواب ہوگا اس تبسم کا
دیکھا اصغر کو مسکرائے حسین

زندگی کا حوالہ کرب و بلا
نسبتِ دل وہی ولائے حسین

تا ابد جنگ ہے اندھیروں سے
کیسے کیسے چراغ لائے حسین

گردشِ جام نہ ہو جراتِ رندانہ نہ ہو
ایسی بستی نہ بسانا جہاں مے خانہ نہ ہو

نارسائی کے عذابوں کی تپش ایسی ہے
خاک ہو جائے اگر آدمی دیوانہ نہ ہو

جو گزرنا ہے گزر جائے یہ ممکن ہی نہیں
رقص مے جاری ہو اور لغزشِ مستانہ نہ ہو

صرصر و ریگ و بگولوں سے ہمیں کیا لینا
اس کو صحرا نہیں کہتے جہاں دیوانہ نہ ہو

دل پہ تہمت نہ دھرو ہم کو دکھاؤ تو سہی
ایسا کعبہ کہ جہاں پہلے صنم خانہ نہ ہو

زندہ رہنے کے میسر نہیں ساماں کوئی
خلقت شہر ہے کہ پھر بھی جئے جاتی ہے

لذتِ نغمہ کو قالب بھی عطا کرتے ہیں
ہم کو خوشبو کی بھی تصویر بنا آتی ہے

ایک امید سحر ایک تمنائے وصال
شام اندھیروں کے سوا اور بھی کچھ لاتی ہے

ہم سے پہلے جو یہاں لوگ رہا کرتے تھے
ان کی خوشبو تو کبھی ان کی صدا آتی ہے

○

ہماری تشنہ لبی میکدے کی بربادی
دراز دستی پیر مغاں ہے کیا کہیے

نشاط بے خودی مے میں ہم کو ہوش نہیں
اب ایسے وقت میں وہ مہرباں ہے کیا کہیے

قدم بگولوں سے باہر نکل نہیں پاتے
ہمارے ساتھ یہ صحرا رواں ہے کیا کہیے

کسی سے داد نہ لے پائے اس کو کیا سمجھیں
یہ معجزہ کہ جو حسن بیاں ہے کیا کہیے

اسے زمانے سے فرصت نہ مل سکی ہوگی
وگرنہ ہم پہ تو وہ مہرباں ہے کیا کہیے

اسے بھی کار زمانہ میں صرف کر بیٹھے
وہ ایک غم جو مرا رازداں ہے کیا کہیے

شرح حدیث غم عاشقی ہے کیا لکھیے
نگارشِ طرب بزم جاں ہے کیا کہیے

جلا کے ہم کو ہی بجھ جائے یہ تو بہتر ہے
جو آگ دل میں ہمارے نہاں ہے کیا کہیے

یہ اور بات کہ رضوی زمیں کا بوجھ ہوئے
ہمارے زیرِ قدم آسماں ہے کیا کہیے

☆☆

کس کے انداز تم نے اپنائے
چاندنی رات چاند یا سائے
ضد سے ہٹ کے ذرا سا واعظ سوچ
لطفِ مے بھی تجھے نظر آئے

○

بند ہے مہ خانہ کا در چلیئے واپس چلتے ہیں
رات کٹے گی سڑکوں پر چلیئے واپس چلتے ہیں

باہر بھی وہی رنگ خزاں کے وہ ہی اکتاہٹ والے
لعنت ایسی اداسی پر چلیئے واپس چلتے ہیں

ایک بے فیض سکوں ہے لیکن پھر اچھا لگتا تھا
گاؤں پیڑ اور کچے گھر چلیئے واپس چلتے ہیں

پچھلے ہرے بھرے موسم میں لے کر ان کو لوٹ چلیں
امیدوں کے سارے شجر چلیئے واپس چلتے ہیں

سارے دوست ہمارے اس بستی کو چھوڑ چلے گئے
دستک دیں اب کس کے گھر چلیئے واپس چلتے ہیں

ساری رات اس درد نگر کی ویرانی کا ساتھ دیا
سوجائیں اب گھر چل کر چلیئے واپس چلتے ہیں

لاکھوں قبریں ایسی ہیں جن پر کوئی دیا نہیں
اور نہ کوئی نوحہ گر چلیئے واپس چلتے ہیں

پیغمبر کے فرائض تو ہیں لیکن کوئی صلہ نہیں
رضوی ہم ہیں پیغمبر چلیئے واپس چلتے ہیں

☆☆

محبت دو دلوں کے جذبۂ باہم کو کہتے ہیں
کشش اک سمت میں کم ہو تو رشتہ ٹوٹ جاتا ہے
نہ پھر کوئی مقام اس کا نہ کوئی روشنی اس میں
ستارہ معتبر رہتا نہیں جب ٹوٹ جاتا ہے

قائم نہ ہو یقیں تو کیا جہت فکر کی
کیا اعتبار عکس جو لرزاں ہے آئینہ

حیرت تو اپنے حسن پہ ہوتی ہے آپ کو
یہ تو فقط گماں ہے کہ حیراں ہے آئینہ

آئینہ بے حسی کی انوکھی مثال ہے
شعلوں کا عکس اور خنک جاں ہے آئینہ

آواز ہے نہ لہجہ نہ الفاظ نہ معنی
زندوں کا ایک شہرِ خموشاں ہے آئینہ

زنگار کے بگڑنے سے جاتا ہے اعتبار
خود اپنے جسم و جاں سے پریشاں ہے آئینہ

تیرا غرور کم نہیں ہوگا کسی لمحے
اے حسن یار تیرا نگہباں ہے آئینہ

صحرا کے عکس کو تو وہ گردانتا نہیں
خود اپنی وسعتوں پہ ہی حیراں ہے آئینہ

مانا کہ اشتعال ہے اپنی شکست پر
رضوی خیال رکھنا کہ نگراں ہے آئینہ

☆☆

آئینے ٹوٹ جاتے ہوں گے
چہرہ پتھر ہو جاتا ہوگا
شہروں پر چھا گئے ہیں جنگل
سورج اب کہاں سماتا ہوگا

○

ہم سے اس جسم کی خوشبو کا بیاں مت پوچھو
لفظ میں کھنچ کے چلی آتی ہے جاں مت پوچھو

سرخرو چہرے پہ سرخی لہو مل کے ہوئے
کس طرح ہم نے کیا کارِ جہاں مت پوچھو

ہر خم و پیچ بہاروں کی لہر کی مانند
ہر ادا میں گل صد برگ نہاں مت پوچھو

وہ نگہ غلط انداز شناسا سی تھی
عندیہ کتنے نہاں کتنے عیاں مت پوچھو

نام لکھنے میں ترے کتنی بہاریں ہم نے
صرف کی کتنی ستاروں کی زباں مت پوچھو

دل میں مستی کا جو طوفان اٹھا تھا رضوی
دیکھ کر تم کو کل اے جان جہاں مت پوچھو

○

لذتِ وصل گئی ہجر کا آزار گیا
اپنے ہی آپ سے اک لمحہ میں، میں ہار گیا

چلئے تبدیلی اندازِ فغاں کرتے ہیں
یا اثر لائی دعا یا دلِ بیمار گیا

میں نے سوچا تھا کہ شاید وہ یہاں سے گذرے
اس طرف آج بھی آنا مرا بیکار گیا

یہ دوراہا ہے کسی راہ پہ جانا ہے ضرور
کوچہ یار نہ پہنچا تو سرِ دار گیا

وہ مواقع جو میرے پاس سے ہو کر گذرے
ان کے ہی ساتھ مرا طالعِ بیدار گیا

اس کنارے پہ خوشحالی کی عجب رسمیں تھیں
وہ بھی کچھ خوش نہیں آیا کہ جو اس پار گیا

ہم نے تو دھوپ میں ہی عمر گزاری رضوی
کیا خبر ہم کو کدھر سایہ دیوار گیا

وہ لہو وہ جگر گیا وہ بھی
ایک کار ہنر گیا وہ بھی

ایک حیرت ہے دل وحشی پر
کیا عجب زیست کر گیا وہ بھی

اب کہاں قربت جمال یار
حادثہ تھا گزر گیا وہ بھی

ایک ہی شخص تو ملا تھا ہمیں
ہم کو بے چین کر گیا وہ بھی

وائے درماندگی محبت کی
وہ جو تھا ہم سفر گیا وہ بھی

کتنا شیریں سخن تھا، میرے نام
تلخیاں کتنی کر گیا وہ بھی

جانے آزار کیا تھا رضوی کو
اپنے ہی آپ مر گیا وہ بھی

آزردگان شہر کوئی بات تو کرو
وہ رت بدل رہی ہے مدارات تو کرو

کوئی تو ہوگا ان میں کہ جو اجنبی نہ ہو
نواردوں سے چل کے ملاقات تو کرو

کوئی جواب ہم کو خبر ہے نہ آئے گا
بہتر یہی ہے پھر بھی سوالات تو کرو

شاید کوئی مسیحا لمحہ بھر کو آ ہی جائے
پھر پوری عمر صرف مناجات تو کرو

شاید کسی چبھن کا لہو رنگ لے ہی آئے
پھر دل کی کرچیوں پہ بسر رات تو کرو

سبزہ و تختہ گل سرد ہوا آتشیں مے
معتدل پھر بھی طبیعت نہیں ہونے پاتی

ہم نے اس شوخ پہ مرنے سے تو توبہ کرلی
اور اب جینے کی صورت نہیں ہونے پاتی

کس طرح لوگ یہاں ترک وفا کرتے ہیں
سوچنے کی ہمیں فرصت نہیں ہونے پاتی

خواب و تعبیر کے یہ سلسلے کچھ ایسے ہیں
ہم کو اب نیند کی عادت نہیں ہونے پاتی

زخم ہوئے عادی ہوائے سر رہ کے رضوی
اب گریباں کی ضرورت نہیں ہونے پاتی

اس کے چہرے کی بات مت پوچھو
روشنی رنگ رات مت پوچھو

جیسے آب رواں پہ دیوالی
یا دھنک ہوگئی ہو متوالی

دامن آب میں ستارے ہوں
جس طرح بھیکے رنگ سارے ہوں

جیسے تابندہ سالِ نو کا جشن
سوختہ جانوں کو نوید امن

خوبصورت سی خبر مل جائے
شوخی گل سے نظر مل جائے

دل پہ گرتی ہو جس طرح شبنم
زخم پہ جیسے خنکی، مرہم

عارض ایسے کہ جیسے شعلہ مے
آگ ایسی کہ دھیمے دھیمے جلے

کہیں پھولوں کی مسکراہٹ ہے
کہیں تاروں کی جھلملاہٹ ہے

چاندنی جیسے اترے پانی میں
لہر سیماب کی روانی میں

زلف رنگوں سے رات کرتی ہو
زلف پھولوں سے بات کرتی ہو

مسکراتا ہوا کوئی تھم جائے
روشنی جیسے لبوں پہ جم جائے

وہ جہاں دونوں ہونٹ ملتے ہیں
کیسے کیسے گلاب کھلتے ہیں

لہریں لیتی ہوئی کرن جیسے
کھلتے پھولوں کی سی پھبن جیسے

جیسے تکمیلِ آرزو کی خوشی
جیسے بے ساختہ سی کوئی ہنسی

نشہ مے ٹھہر گیا جیسے
چاند دل میں اتر گیا جیسے

حسن اور استعجاب مل جائے
حسن تعبیر و خواب مل جائے

رضوی اس کا بیاں نہیں ہوتا
اس پہ سچ کا گماں نہیں ہوتا

☆☆

ہم نے دلچسپیٔ اندازِ بیاں کی خاطر
عشق میں حسن کے افسانے ملا رکھے ہیں

○

ایک قصیدہ بنام نومولود
شارح کائنات بود و نبود

حاصل فصل نو بہار ہے یہ
رنگ و خوشبو کا شاہکار ہے یہ

کیسی تخلیق کہ خالق حیراں
کتنی پردوں میں ایک طلسم نہاں

ایک ننھی سی چیخ کی آواز
اور بجنے لگے دلوں کے ساز

کیا مسرت نواز رونا ہے
کس قدر دلنواز رونا ہے

انبساط حیات اس کی صدا
جیسے سب کائنات اس کی صدا

رجز روشنی سناتا ہے
زندگانی کا راگ گاتا ہے

وہ صدا اپنے آپ میں سرشار
جرس فصل گل صدائے بہار

کتنا معصوم اور کتنا عجیب
سادگی و طلسم کی ترکیب

دہن غنچہ مسکراتا ہے
پھول کا رنگ کھلکھلاتا ہے

یوں جھٹکتے ہیں ستاروں کی ردا
ایسے شبنم سے گذرتی ہے صبا

ایک کھنکتا ہوا ترنم ہے
چاندنی میں کوئی جھرنا گم ہے

کیا حسیں معجزوں کا موسم ہے
کیسا کلکاریوں کا عالم ہے

رخِ مہتاب و جبیں خورشید
منبع نور ہے اس چہرہ کی دید

چاندنی اس کی مدح کہتی ہے
کہکشاں آس پاس رہتی ہے

جتنے جگنو ہیں جتنے تارے ہیں
اس کی آنکھوں کے عکس سارے ہیں

ہاتھ چلتے ہیں پیر چلتے ہیں
خود مچلتے ہیں خود بہلتے ہیں

مٹھیوں میں جکڑ رہے ہیں ہوا
چتونوں سے پکڑ رہے ہیں ہوا

کیسا گل گوتھنا پن آیا ہے
دل لبھانے کا چلن آیا ہے

مسکرا دیجیے مسکرا دے گا
کوئی روتا ہو یہ ہنسا دے گا

سیم و زر کی وہ کائنات ہے یہ
ماہ و خورشید کی نجات ہے یہ

☆☆

ناراض تھا خفا تھا پریشان تھا بہت
چھیڑا جو اس کا تذکرہ دل آپ من گیا
آخر تو کچھ کیا دل ناکردہ کار نے
کافر نہ بن سکا تو مسلمان بن گیا

○

اس جمال رخ رنگیں کی مدح کیجئے رقم
چاندنی صفحہ قرطاس ہو نظریں ہوں قلم

اے مری جراتِ اظہار سہارا دے مجھے
اس سے کچھ کہنا ہے اے حوصلہ عرض ستم

ہجر آنگن میں دمکتے ہوئے ہیروں کا ہجوم
ہجر اس شوخ کا عکس اور مری چشم نم

وصل اس شوخ کی خوشبوؤں سے بھیگی ہوئی شب
وصل اس شوخ کے رنگوں سے جھمکتا عالم

اے شب ہجر میرے دل کے قریں رکھ دینا
آنچ اس شعلۂ رخسار کی مدہم مدہم

○

کچھ نیند کے جھونکوں کو ملے زلف کا سایہ
کچھ خواب تری عنبریں بانہوں پہ رقم ہوں

بہکی ہوئی بانہوں کے سہارے کا نشہ ہو
اس دل میں رخ یار کے سب رنگ بہم ہوں

ان آنکھوں پہ حیراں رہے چشمِ غزالاں
یاقوت لبِ یار کے مائل بہ کرم ہوں

نغموں کے سر و تال سا لہراتا سراپا
بل کھائے ہوئے مخملی جسموں کے صنم ہوں

رفتار ہو کہ موج سر آبِ رواں ہو
اور چال کا وہ حسن کہ آہو کے سے رم ہوں

لہجہ میں تکلم میں ترنم میں نئے روپ
بجتے ہوئے ساغر سے مرے، شیشہ جم ہوں

خوشبو میں سموئی ہوئی رنگوں کی پھواریں
شبنم سی اترتی ہوئی بھیگے ہوئے ہم ہوں

☆☆

ایسی آیت حسن پہ پہلے کب اتری
ختم اس عارض پر ہم نے حجت کرلی

مرنا کون سا ایسا مشکل کام ہوا
ایک لمحہ میں دنیا سے فرصت کرلی

جب جی چاہا اہلِ خرد میں جا بیٹھے
جب جی چاہا وحشت کی عادت کرلی

یوں تو کس کا دعویٰ ہم نے مانا ہے
ہاں اس چہرے پر ہم نے بیعت کرلی

ہم سے شاید ترک تعلق نہ ہوتا
اچھا ہے کہ آپ نے خود زحمت کرلی

○

نغموں پہ محبت کے بدن جھوم رہے ہیں
اک نشہ سا چڑھتا ہوا تن جھوم رہے ہیں

کیا شان توانائی اظہارِ نمو ہے
ٹوٹی ہوئی شاخوں کے بدن جھوم رہے ہیں

اے روحِ چمن ہم تو تقاضا نہیں کرتے
خود لالہ و نسرین و سمن جھوم رہے ہیں

ان داتا کی مٹھی میں رہا کرتے ہیں ہم لوگ
اے نانِ جویں اہلِ سخن جھوم رہے ہیں

ہر ایک اپنی ذات میں ایک انجمن بھی ہے
بکھرے ہوئے سب رنگ چمن جھوم رہے ہیں

مندر کی گھنٹیاں بھی بہت دلنواز ہیں
اور سن کے مؤذن کا لحن جھوم رہے ہیں

اپنی ذات کے آگے میں نے
دستِ دعا بلند کئے
اور یہ مانگا
جب تک میں سانسیں لیتا ہوں
یا جب میں مرنے لگوں
صاحبِ جائیداد ہونے کا کوئی دھبہ
میرے نام نہ آئے
مرے خالی ہاتھوں پہ یہ لکھا ہو
مرنے والے کی کوئی حیثیت نہ تھی، نہ وقعت تھی
اگر جائیداد سے وقعت اور حیثیت تولی جائے
مری خالی ہتھیلی پہ لکھا ہوا ہو
کہ میں نے ذہنی غلامی کی پہلی
مستقل علامت کو قبول نہیں کیا
کہ میں نے ملکیت کے پروردہ
جذبہ تفاخر کو
تسلیم نہیں کیا

میں نے عزت کے اس گھٹیا معیار کو نہیں مانا
میری پیشانی پہ لکھا جائے
کہ یہ شخص
گھر چاہتا تھا رہنے کے لیے
اسکول چاہتا تھا تعلیم کے لیے
روزگار چاہتا تھا باعزت روزی کے لیے
اسپتال چاہتا تھا علاج کے لیے
میری پیشانی پہ لکھا جائے کہ اس شخص نے فروخت ہونے سے انکار کر دیا
میری آنکھوں پہ تحریر کیا جائے
کہ یہ شخص خود آج کی آگ میں جل رہا تھا
لیکن اپنی آنکھوں میں
آنے والی بہار کی خنکی کو محسوس کر رہا تھا
اور اپنے انکار سے
نئے عہد کا اثبات کر رہا تھا
یہ شخص جو مر رہا تھا
زندہ رہنے کے لیے مر رہا تھا

کارِ دنیا غمِ جاناں سے بھی مشکل نکلا
یہ زمانہ تو مری جاں بڑا قاتل نکلا

شیریں گفتاریِ واعظ پہ ہمیں حیرت تھی
نشہ مے تھا خطابت میں جو شامل نکلا

زخم کی داد ہمیں ملتی تو کس سے ملتی
غیر تو ہم سے زیادہ ترا گھائل نکلا

ہر لہر سے وہ سمندر کی خبر پوچھتا ہے
کس قدر پیاس کا مارا ہوا ساحل نکلا

چلتے چلتے بھی ہمیں نصف صدی بیت گئی
راستہ کوئی نہ اب تک سرِ منزل نکلا

عشق میں آگہی حسن طلب کرتا ہوں
حیرت شوخی و غمزہ کا میں بسمل نکلا

اس کو میں غیر سمجھتا رہا لیکن رضوی
وہ تو میں خود ہی تھا جو اپنے مقابل نکلا

آتی ہے بیاباں سے جو یاہو کی صدا اور
شاید دلِ وحشی کو کوئی زخم لگا اور

وہ لمحہ جو دنیا کو حسیں کرتا چلا جائے
کیا ہے صلۂ لالہ و گل اس کے سوا اور

شاید یہ ریزہ ریزہ بدن اور بھی بکھرے
اس حال میں بھی دو مجھے جینے کی دعا اور

چمکے گا میرے نام پہ ہر صبح کا خورشید
اپنائے ہیں میں نے یہاں اندازِ فنا اور

تین شعر

درد وحشی ہی سہی آرزو صحرا ہی سہی
تجھ کو منظور تماشا ہے تماشا ہی سہی

دیکھیں کب تک نہ سراہے گی جنوں کو میرے
میری دنیا نہ سہی یہ تری دنیا ہی سہی

معتبر آج ہے منصور بھی کل رُسوا تھا
دار پر میں بھی ہوں رُسوا ہوں تو رُسوا ہی سہی

تین شعر

گرداں ہیں ہوا کے ساتھ پتھر
ہیں زخم پیراہن بدن پر

مقتل نہیں کارِ بے ہنری
کشکول نہیں ہے کاسۂ سر

کچھ راہ چلے کچھ باقی ہے
ہم مستقبل کے نامہ بر

امن کی خاطر

میری خاطر اپنی خاطر
دیس بدیس کے سارے لوگو
آؤ
بچوں کو کندھوں پہ بٹھالیں
ایک سے ایک کا ہاتھ پکڑ کر
بانہوں کا اک گھیرا بنالیں
اس گھیرے میں دنیا کو لے لیں

قطعات

نہ کوئی دستِ حنائی کہ کہیں دل ٹھہرے
نہ کہیں دور تلک عشق وطن کی تعبیر
کوئی تسکین کا ساماں ہی نہیں
پھر بھلا جی کے کریں کیا
اے دل۔اے دل

☆

مری منڈیر پر یہ کتنے چراغ روشن ہیں
خلا میں پھرتا ہوں میں جیسے اپنے گھر میں ہوں
میں اپنے خوابوں کو صیقل نہ کیوں کروں، میں بھی
حصول خواب کی تکمیل کے ہنر میں ہوں

☆

تپش دشت نے کانٹے سے سکھا ڈالے ہیں
وہ چمکتے ہوئے چہرے وہ دمکتے ہوئے گھاؤ
پھر سمٹنے لگے ہیں ذہن میں احساس کے روگ
لاؤ پھر آتش سیال کا بدمست الاؤ

☆

☆

پتھر گرے تو آخری تہہ تک اتار دوں
ہر ظلم کے خلاف صف آرا ہوں دوستو
بہتا ہے وقت ساتھ کہ سیل شعور ہوں
میں کائنات کا نیا رستہ ہوں دوستو

☆

تمام زخم میری آرزو کے زخم نہ تھے
مگر وہ زخم کہ جو تجھ سے فیض پاتا رہا
نمو کے زور کو ڈھا نہ سکی خزاں کی ہوا
وہ اک پھول سر شاخسار آتا رہا

☆

برسوں ہم نے سوچا سمجھا برسوں ہم نے غور کیا
تب ہر اور سے ناطہ توڑا اور یہ جنوں کا طور کیا
دل نے ایسی شورش کی ہے ہم نے گریباں چاک کیا
فصل بہاراں آئے نہ آئے ہم نے اپنا طور کیا

☆

پہرے لگے ہیں رقص تمنائے یار پر
لیلائے شہر ترے دوانوں کی خیر ہو
شعلے نکل رہے ہیں طلسم بہار سے
عہد خزاں کے سوختہ جانوں کی خیر ہو

☆

افسوس یہی ہے ہم کو اے دل
ہم اس کے رازداں نہیں ہیں
اب یہ حساب کیسے کیجیے
وہ کب سے مہرباں نہیں ہیں

☆

سرمایہ درویش قبا سوختہ کیا ہے
کچھ زخموں کے پیوند ہیں کچھ دولتِ دشنام
ایک لہر ہے بیتابی کی ایک موسم الزام
اے شہر دل آرام

☆

میری رسوائی کی رونق ہے وگرنہ واعظ
شہر کو دیکھنا صحرا کا نظارہ نکلا
ہم یونہی چاک گریباں تو نہیں کرتے
درد سمجھتے تھے جسے تیرا اشارہ نکلا

☆

آوارگی سے وسعتِ فکر و نظر ملی
دنیا کو دیکھتے تھے تب اپنی خبر ملی
معلوم یہ ہوا کہ میں ہوں سب کے ساتھ ہوں
آئینہ حیات سے جب بھی نظر ملی

☆

یہ رنگ یہ مہک یہ سراپا یہ نازکی
سچ کہنا یاروں ایسی کوئی شے چمن میں ہے
سمٹے تو کائنات ہے پھیلے تو لامکاں
وہ لوچ وہ رچاؤ جو تیرے بدن میں ہے

☆

جب تیرا درد فروزاں ہوگا
کس قیامت کا چراغاں ہوگا
کربلا ہے یہاں وہ قتل ہوگا
آج کی رات جو مہماں ہوگا

☆

روز طوفاں سر اٹھاتا ہے
سورج ہر روز مسکراتا ہے
پھر مرا درد سوالی ہوگا
پھر ترا شہر یاد آتا ہے

☆

کن منزلوں پہ ٹھیرا ہے محرومیوں کا درد
اپنے کراہنے سے مری آنکھ کھل گئی
اب یاد بھی نہیں ہیں جو لکھے تھے اسمیں نام
سیلِ بلا میں فردِ غمِ یاد ڈھل گئی

☆

پھر ضرورت ہے گلستاں کو لہو کی شاید
سوختہ جاں کو بہاروں کے سلام آنے لگے
وہ ترے جسم کے پیچیدہ و پرکار خطوط
دل میں بے نام تمناؤں کے نام آنے لگے

☆

بھیگی رات میں کتنے شعلے دل پر آئے گذر گئے
جل کر راکھ ہوئے کچھ موتی اور کچھ موتی بکھر گئے
صدیوں سے جو زخم کھلے ہیں ان زخموں کا ذکر ہی کیا
یہ تو ہوا کہ غنچے مہکے گلشن گلشن سنور گئے

☆

پہلے آئے ہیں کبھی اہلِ کرم کے در پہ
کیسے ممکن ہے فقیروں کی صدا رد ہو جائے
پھر دکھاتا انہیں سینۂ ہجراں کا کمال
یوں اگر ہوتا کہ موسیٰ کی دعا رد ہو جائے

☆

میکدہ میں تو شب و روز یہی رہتا ہے
کبھی سناٹا کبھی حشر بپا ہوتا ہے
زخم بھر جاتے ہیں تو کھول لیا کرتے ہیں
ہیں وہ بیمار مسیحا بھی خفا ہوتا ہے

متفرقات

اے اوجِ صلیب ہم بھی دیکھیں
منزل اب سامنے ہی ہوگی

☆

سنگ و آہن نہیں طاقت نہیں تقدیر نہیں
ظلم ٹوٹے ہوئے حلقہ تو ہیں زنجیر نہیں

☆

وہ لوگ جن سے رسم و رہ عاشقانہ تھی
ملتے نہیں ملیں بھی تو پہچانتے نہیں

☆

راس آیا یہ شناسائی کا انداز ہمیں
شہر میں اب کوئی دیتا نہیں آواز ہمیں

☆

سربلند دار پہ ہوتے ہیں کہ منزل دیکھیں
اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ کچھ دور نہیں

یا صحنِ گلستاں میں ہوں گے یا کوچہ جاناں میں ہوں گے
جو آگے جانے والے تھے وہ منزلِ زنداں میں ہوں گے

☆

مرے غم کی وقعت ہی کیا مگر اتنی تو خبر ہے
یہ ہجومِ چارہ سازاں اسی غم سے معتبر ہے

☆

دل ریت کے صحرا کی طرح ہے کہ جہاں پر
امیدوں کے کانٹوں کے سوا کچھ نہیں ملتا

☆

جب بھی کسی چہرے سے سرک جائے نقاب
ہر شخص کسی شخص کا قاتل نکلے

☆

نیکیاں اب بھی ہیں لوگوں میں ولے کیا کہیے
کہ وقف نہیں یہ بروں کی خوشامدوں کے لئے

☆

گہرے سمندروں میں خزانے عظیم ہیں
غواص سے یہ پوچھو کہ ساحل کو کیا دیا

☆

یہ میرا جام ہے دارا و جم کا جام نہیں
لہو حرام ہے انساں کا، مے حرام نہیں

نہ کاروبار گلستان نہ فصل شوق گراں
کچھ اور بات تھی کی ہے جو ہم نے جاں ارزاں

☆

برہمی رندوں سے ہے ساقیا بے حسن سبب
تلخی مے جو ہو کم ، خام ہے احساس طلب

☆

صدیوں کی بندشوں سے میں آزاد تو ہو لوں
پھر میرے دست و بازو کا پھیلاؤ دیکھنا

☆

جان میں لطافت غم جاناں ہے جس طرح
جاڑوں کی چاندنی مرے سائے میں گھل گئی

☆

تنہا رہا نہ ہوں گا صیاد
زنداں کی بھی کچھ آبرو ہے

☆

ظرف کی بات ہے اے دوست وگرنہ کچھ لوگ
چھلک اٹھتے ہیں اگر درد تہہ جام ملے

☆

لگتی تھیں بھلی اسکی باتیں جب راستے میں تھی مے نوشی
واعظ سے خدا حافظ کہیئے اب اپنی منزل آ پہنچی

میں نے اپنا لہو کیا روشن
مجھ کو تقلید کا الزام نہ دو

☆

ہر زندہ صداقت کی جو تقدیر رہی ہے
اس عہد میں ہم نے بھی وہی بات کہی ہے

☆

منصور و کوہکن کے زمانے رقم ہوئے
میں چپ رہا تو کیا کیا فسانے رقم ہوئے

☆

قتل کے بعد بھی سرگرداں ہیں قاتل میرے
کیا کہیں کیسے کہیں قتل کیا ٹھیک کیا

☆

دیس پردیس شناسائی مری
مجھ سے آگے گئی رسوائی مری

☆

فن کی قبر بنا کر اس پہ عرس کریں تو بات بنے
مردہ پرستوں کے جنگل میں کھوئے گئے ہم زندہ لوگ

☆

تم کو اس راہ پر چلتے ہوئے دیکھا ہم نے
پھر یہ دل مانا نہیں راہ بدلنے نہ گئے

زندہ رہنے میں کوئی بے بسی محسوس نہ ہو
اتنا درکار ہے سامان نہ قناعت نہ ہوس

☆

بے مہریٔ یاراں سے نہ مایوس ہو رضوؔی
سایہ تو کبھی دے گا بہرحال شجر ہے

☆

ہم شعلہ تخلیق اسے کہتے ہیں
کوئلہ میں اتر جائے تو ہیرا کر دے

☆

تپش ہے شعلہ تخلیق کی جو ہیرا ہے
بنا عذاب لئے آگہی نہیں آتی

☆

یارو یہ بھرے شہر کا سناٹا تو ٹوٹے
پتھر ہی کسی بند دریچے پہ مار دو

☆

گھور اندھیرا بستی بستی اور لٹیرے آئے
ہے کوئی جو گھر کو جلا کر سارا گاؤں جگائے

☆

ہیں بے پناہ الجھنیں جن میں گھرا ہوں میں
آخر، حیاتِ نو تیرا مشکل کشا ہوں میں

کب قامت دراز پہ سائے دلیل نہیں
سورج کے زاویوں سے جو سائے طویل ہیں

☆

ہم تو یہ سوچ کے چپ ہو بیٹھے
دوستو سے گلہ نہیں کرتے

☆

کششِ دائرہ میں قید ہے پرکار جنوں
متصل مری نگاہوں سے حد صحرا ہے

☆

رضوی ظلم کا کوئی اپائے بھی تو کرو
جلے گھروں کی راہ میں کب تک مایا ڈھونڈیں

☆

سب منزلیں ظلم کی گواہ ہیں
سب میرے سفر فرات سے ہیں

☆

دل کی تہہ سے تمام عالم تک
موجۂ درد، موجۂ گرداب

☆

دن ڈھلتا ہوا رک گیا رات آتی رک گئی
سائے سے جم گئے در و دیوار یہاں کے

جاں نذر سخن جسکے لئے کر کے چلے آئے
وہ شخص بھی الفاظ کو کم تول رہا تھا

☆

گو سینہ زخم کشادہ ہے پر دل ہے کشادہ تر اس سے
زندہ ہیں تیرے ہجر میں بھی یہ وار تو گہرا نہ گیا

☆

ہم اہلِ چمن کے لیے سبزہ کی لہک ہیں
بات آئے جو صحرا پہ کوئی شعلہ بپا ہیں

☆

لرزاں لغزش سے ہماری ہے شبستاں وجود
اور سوئے دیر و حرم ہم بھی سنبھلنے نہ گئے

☆

سورج نے موسموں کو دکھائے ہیں راستے
سورج نہ ہو تو کتنے پرائے ہیں راستے

☆

شعور زیست ہے سورج کی روشنی کی طرح
جو تم نہ مانو تو جلتا ہوا بدن منوائے

☆

کچھ اس نے سیاست کی کچھ میں نے سیاست کی
کل ملنے کا وعدہ تھا میں پہنچا نہ وہ آیا

ترکِ وفا تلون فطرت پہ بار ہے
اک خوئے بد عہد پہ مرا اعتبار ہے

☆

ہم جو رہزن سے قتل ہوتے رہے
قافلہ آگے بڑھ گیا ہوگا

☆

کچھ پردہ داری غم الفت سے پائے ہیں
کچھ زخم غمگساریٔ ناصح کی عطا ہیں

☆

کچھ اس کوچہ کا پاس کیا کچھ ہجر کی بھی دلداری کی
ورنہ ہمیں دعویٰ عشق کا تھا اک محشر برپا کر دیتے

☆

کفِ ساقی سے دستِ قاتل تک
صد لہو رنگ بدلتی ہے شام

☆

ایسا کیوں ہوتا رہتا ہے یہ تو مجھے معلوم نہیں
دھوپ چھاؤں کے کھیل میں اکثر دھوپ حصے میں آئی ہے

☆

اس بستی میں چور کہاں ہیں جو کچھ ہیں رکھوالے ہیں
اور رکھوالوں کا کہنا ہے چور تو یہ گھر والے ہیں

جب منجدھار میں تھی کشتی دو ہاتھ سہارے کو نہ ملے
جب کشتی ساحل پر پہنچی سو ہاتھوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا

☆

اپنے کاندھوں پہ لئے نکلو صلیب غم دل
منزل عشق یہ لہو نقش فسانے مانگے

☆

حاکم شہر کے ہاتھوں سے جو نکلی ہوگی
برق گرتی کہاں انبوہ پریشاں کے سوا

☆

صرف ہو جاتی ہے دنیا کے حوادث میں روح
ملک الموت کو کیا بچتا ہے لے جانے کو

☆

شاید آہنگ بلند ہو تو کوئی سن پائے
لحنِ شور میں اپنی ہی صدا اور سہی

☆

تم سراپا کی بات کرتے ہو
اس کی آنکھوں میں کھو گئے ہیں ہم

☆

آئینہ خانۂ دل اور تمنا زخمی
جس طرف دیکھئے اک موجہ خوں موجہ خوں

بڑے خلوص سے کرتے ہیں تعزیت میری
وہ میرے دوست جنہوں نے کیا ہے قتل مجھے

☆

وہ عکس تو بھرپور اتارا نہیں جاتا
گر جائے عجب کیا ہے جو آئینہ نظر سے

☆

اپنی انا کے اپنے مفادات کے لئے
یاروں نے اپنے شہر کو قربان کردیا

☆

خلا کو میں خدا لکھتا رہا ہوں
غلط اردو ہے کیا لکھتا رہا ہوں

☆

آبادیوں کے دشت میں چلتی ہوئی ہوا
جاتی ہے ساتھ کتنی کراہیں لیے ہوئے

☆

اہلِ قفس کے سامنے شرمندگی نہ ہو
صیاد رہا ہونے کی مجھ کو خبر نہ دے

☆

اب ہوش کہاں شعلہ رخسار کا ہم کو
اس سارے سراپا پہ محبت کی چھوٹ ہے

ساعت کو کیا صدیوں میں ہم نے تقسیم
ہر جنبش ابرو کو فسانہ لکھا

☆

دل کی اداسیوں نے دیا ہی نہیں جواب
موسم کی دستکوں سے دریچے نہیں کھلے

☆

اجنبی ہوگئے جب لوگ تو یاد آیا مجھے
آشنا چہروں سے وحشی کو گزارا جائے

☆

آج اگر ہوسکے تو نہ جاؤ
آج کی رات دل پہ بھاری ہے

☆

جس نے بھی دیکھی ہیں مجبوریاں مجبوروں کی
اس کا احساس یہ کہتا ہے خدا سے لڑ جائے

☆

عزتِ نفس بن گئی دلدل
اپنے ہی پیر دھنستے جاتے ہیں

☆

مجھ سے ہے حسنِ شہرِ طلسماتِ رنگ و بو
میرے لہو سے گل بھی ہیں گل پیرہن بھی ہیں

شہر میں پھرتا ہوں میں مثلِ صبا آوارہ
اجنبی خلق میں جیسے ہو خدا آوارہ

☆

کوئی مجھ سا گذر گیا شاید
دل پہ کچھ بوجھ بڑھ گیا ہے آج

☆

رضوی اس بستی میں کس سے پوچھئے اس کا پتہ
اجنبی راہیں زباں ناآشنا بیگانے لوگ

☆

ایسا سمو لیا ہے تمہیں اپنی روح میں
میرے ذہن سے نام تمہارا نکل گیا

☆

کوئی ہنسی کی کرن مستعار ہی لاؤ
دکھوں سے رات سیاہ ہے سحر کرو یارو

☆

بجا ہے وحشت دل صبح ہونے دو رضوی
کہاں چلے ہو شہر میں ابھی اندھیرا ہے

☆

اک مسئلہ ہے عزت نفس آدمی کے پاس
دشوار ہے کہ اس میں برابر ہو آدمی

جذبوں پہ نہیں شعور حاوی
جانے انساں ابھی کہاں ہے

☆

ڈھانپے ہوئے قبائے جنوں سے فشار دل
ڈھونڈا کئے ہیں ہم بھی مسیحا کبھی کبھی

☆

دیس پردیس سے یاروں کے سلام آتے ہیں
کیسے تحفے میری رسوائی کے نام آتے ہیں

☆

دیکھا ہی نہیں اس نے قد یار کا عالم
محشر سے جو جھگڑا ہے مقابل کا نہیں ہے

☆

تجھ سے مل کر مجھے محسوس ہوا ہے جیسے
نیند میں تازہ گلابوں کی مہک آتی ہے

☆

اس کی ناراضگی کا حسن نہ پوچھو
وہ خفا ہو کے مسکراتا ہے

☆

ہاں عشق چمن آرائی ہو کم سے کم اتنا تو ہو
اک آگ کا دریا بہتا ہے اور پار اترنا لازم ہے

ستم کی شب ہے مری سوچ کے ستارے ہیں
یہ ساتھ ساتھ رہیں گے سحر کے ہونے تک

☆

کوئی خوشبو نہیں اس جسم کی خوشبو کی طرح
اور کوئی بھی رنگ نہیں رنگِ حنا کی مانند

☆

ہیں یادِ غمِ عشق کے اس درجہ صحیفے
یوں لگتا ہے بارِ دگر سیکھ رہے ہیں

☆

گلوں کی قدر کر گلچیں کہ ان کی آفرینش پر
رگِ جاں چاک ہوتی ہے سینہ چاک ہوتا ہے

☆

ایسا نہ ہو کہ تم بھی دعا مانگنے لگو
زخمی کیا ہے جس کو وہ زندہ تو رہ سکے

☆

جذبوں پہ کم گرفت گر ہو شعور کی
تو آدمی میں ابھی وحشتوں کا ورثہ ہے

☆

ہے کوئی جو اسے بچائے
بستی کو کھا رہا ہے دریا

کشتِ زعفران

سڑکیں اسکول ٹیوب ویل نہریں
بن جائیں جو مل جائے تھوڑا روپیہ
بچتا ہی نہیں ہے بجٹ میں اپنے
کھاتا ہے بجائے گھاس گھوڑا روپیہ

☆☆

ہم بھول گئے اس پہ عمل کیسے ہو
آئین بنائے ہوئے مدت گزری
گھبرا کے گورنر پہ گورنر مارا
عجلت میں قرارداد الٹی لکھ دی

☆☆

کب ٹیکس سے بچی تھی شادی
اب کے نہ بچیں گے شادی گھر بھی
اے قبلہ بزرگ سرتاج عزیز
اک ٹیکس سہاگ رات پر بھی

☆☆

زبردست تنقید کرتے ہیں وہ
کہ جیسے وہ کھینچیں گے اگلوں کی پوست
ڈنر میں ہے ملکی وسائل کی ڈش
برین خوان نعما چہ دشمن چہ دوست

☆☆

ہے گلشن اقبال و کربلا رشتہ دار
دونوں میں وہی گرمی وہی ویرانی
آتی ہے کربلا سے العطش کی آواز
گلشن سے صدا آتی ہے پانی پانی

☆☆

کہا تھا ہم نے پہلے ہی کہ ترکی سیکھ کر جانا
جسے مٹیار کہتے ہیں وہاں ہوتی ہے وہ خانم
نکل جائے جو ہاتھوں سے تو اب کہنے سے کیا حاصل
زبان یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

☆☆

چھیڑ خوباں سے چلی جائے مگر یوں نہ ہوں
اس طرف جاں ادھر جانِ تمنا نکلی
اک غلطی سے بپا ہوگیا ہنگامہ حشر
میں پڑوسن جسے سمجھا تھا وہ زوجہ نکلی

☆☆

بے سوچے آپ کرنے لگے ہیں مطالبہ
اسلامی عدل کا یہاں پرچم علم کریں
ایسا نہ ہو کہ تفرقہ بازی کے جرم میں
مولانا پہلے آپ کا ہم سر قلم کریں

☆☆

گلہ کریں ستم ایجاد کا تو کیونکر ہو
یہ مفلسی کو ہماری نکھار دیتا ہے
تمام سال جمع کرتا ہے بلائیں فلک
بجٹ کی شکل میں ہم پر اتار دیتا ہے

☆☆

تو بے مثال ہے تو بھلا لوگ کیا کریں
کیا فائدہ جو ڈھونڈ کے لائیں تیری مثال
کچھ اور ڈوب جائیں گے حالات ہمارے
دو ایک اور ہوگئے گر ربِ ذوالجلال

☆☆

ادھ کٹی گردن کی مرغی کی طرح
قوم کو یوں نہ تڑپتا چھوڑیئے
گر ذبیحہ کرنا ہے پھیریں چھری
جھٹکا کرنا ہے تو گردن توڑیئے

☆☆

پوچھا کہ صدر اور اسمبلی کے بیچ
کیا رشتہ ہے کی عرض ”بے نامی شادی“
پھر پوچھا کہ 90 کے الیکشن کیا تھے
ہاتف نے صدا دی ”انتقامی شادی“

☆☆

رش ہوتا ہے اتنا کہ سبھی پھنستے ہیں
پیدل ہو سواری ہو امیر ہو کہ فقیر
مردوں کو فقط راستہ مل جاتا ہے
آسان گذرتا ہے جنازہ یا وزیر

☆☆

کبھی لقا کبھی شیرازی بنا پھرتا تھا
لہریں لیتا تھا کسی شوخ کے گیسو کی طرح
جب سے مڈٹرم الیکشن کا چلا ہے قصہ
کیسا بیٹھا ہے کبوتر مرا الّو کی طرح

☆☆

زندگی کے فلسفے دو ہی تو ہیں
جس پہ جی چاہے عمل فرمایئے
یا کسی کے پیٹ میں گھونپیں چھری
یا چھری کھا کے پرے ہٹ جایئے

☆☆

مہرے کی کسی چال کا دیتے ہیں جواب
یا ہے یہ مکافاتِ عمل کا کوئی باب
کیا کہتا ہے اے قوم نجومی کا حساب
خود آیا ہے کہ لایا گیا ہے سیلاب

☆☆

ہم ہیں دو تہائی ارکان
ہم سے صورت نہیں مفر کی
کہتے ہو جمہوریت جسے تم
لونڈی ہے وہ ہمارے گھر کی

☆☆

جانے دیتی نہیں نگاہ تری
اور جاء نشست اپنی عجیب
اک پہلو میں کانٹے چبھتے ہیں
دوسرے پہلو میں بیٹھا ہے رقیب

☆☆

نہ شاہ چاہیے نہ ہارون چاہیے
اس جسدِ سیاست کو نئی جون چاہیے
ناطاقتی سے زانو پہ رکھے ہوئے سر
اس قوم کو خمیرہ و معجون چاہیے

☆☆

ہرگز نہ کہیے پردہ کے پیچھے کا کاروبار
ہرگز نہ کیسے بھرتے ہیں لوٹے دکھایئے
ہے اشتعال افزا سیاست کی پوری فلم
بہتر ہے بس عوام کو ٹوٹے دکھایئے

☆☆

مہنگائی یوں نہ ہوتی جو خانہ خرابِ عشق
اس کی ہر اک بات بڑی دلنواز تھی
میں عرض کر رہا تھا کہ کیا بیتی ہجر میں
اور وہ یہ پوچھتے تھے کہ کیا بھاؤ پیاز تھی

☆☆

کہہ رہا تھا کمہار میرے رب
گر ہنر اپنا آزماتا میں
جیسا تو نے مجھے بنایا ہے
اس سے بہتر تجھے بناتا میں

☆☆

معیار نرالے ہیں یہاں حب وطن کے
جو فرض کو پورا کرے وہ کرتا ہے احسان
جو کام کرے اس کا ہے حق دیجئے اسکو
رشوت ہو ریبیٹ ہو کہ فری ٹیکس کہ تاوان

☆☆

مذہب تو میرا مسئلہ ذاتی ہے
مذہب کو سیاست میں نہ آنے دیجئے
لازم ہے کہ اس ملک کی صحت کے لئے
میں کچھ نہیں کہتا چلیں جانے دیجئے

☆☆

ریس کرتے چلے گئے گھوڑے
اور کبوتر فضاؤں میں گم ہے
لوگ کھا کر نکل گئے پیسہ
ہم ہیں اور احتساب کی دم ہے

☆☆

تہذیب سے تو ہٹ کے سیاست نہ کیجیے
خود پر بھی چھینٹ آئے گی کیچڑ نہ پھینکئے
پھر کرچیاں سمیٹتے گذرے گی ساری عمر
شیشے کے گھر میں بیٹھ کے پتھر نہ پھینکئے

☆☆

زندگی بھر رہے یوں تجھ سے محبت جاناں
دونوں ہم ایک رہیں کنج چمن بھی ہو ایک
تا قیامت رہے یہ وصل کی صورت جاناں
قبر بھی دونوں کی ہو ایک کفن بھی ہو ایک

☆☆

ہے نامہ اعمال تو دونوں کا ہی سیاہ
بچتا ہے پھر بھی قبر کے خوف و ہراس سے
آدھے کفن میں دونوں کو لپٹا کے دفن کر
پھر دیکھیں کیسے گذریں نکیریں پاس سے

☆☆

ہارے امیدوار کے بچوں نے یہ کہا
ممی شکست خوردہ ذہن سے بچایئے
بچوں کا اعتماد ہے جیتا امیدوار
اس کو نکالئے اور اسے لے کے آیئے

☆☆

کم نشے پر لگاتے ہیں قدغن
زیادہ کا احترام کرتے ہیں
چار زوجاؤں کی اجازت ہے
اور مے کو حرام کرتے ہیں

☆☆

سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہیں نجومی خاموش
چپ گرانی کے ہیں فیاض خدا خیر کرے
راکھشیش خانہ مہنگائی میں جا بیٹھا ہے
قیمتیں ہم سے ہیں ناراض خدا خیر کرے

☆☆

ہزاروں سال کا ہے تجربہ ہم اہلِ ایماں کا
رہے جس سے چشم گریاں وہ ہاتھ اٹھتا ہے ماتم کو
الیکشن منصفانہ ہوں ترقی اقتصادی ہو
یہی وہ دو حوادث ہیں جو راس آتے نہیں ہم کو

☆☆

دریا کا ہے اپنا مزاج
ناؤ جس بل بیٹھے
اونٹ کی مرضی کو کیا کہیے
اونٹ کی مرضی جس کل بیٹھے

☆☆

شاہراہوں کی رونقیں جاگیں
اور شب کی بہار کم نہ ہو
دل کو ہے پھر اسی سکوں کی تلاش
جز غمِ یار کوئی غم نہ ہو

☆☆

اپنی رقمیں لگائیں ہی کیوں
نہ نقد ہو نہ ادھار کیجئے
یہ انتہائی منافع بخش ہے
سازش کا کاروبار کیجئے

☆☆

اس فصل میں مانتا ہوں آم بہت ہے
لیکن مری جان اس کا ابھی دام بہت ہے
قیمت نہیں پوچھوں گا کہ مرجانے کا ڈر ہے
غم کھائے بودا دلِ ناکام بہت ہے

☆☆

حیرت سے پوچھتا تھا خداوند روزِ حشر
کس طرح کی شرعی ہے کیسا عمامہ ہے
تخلیق کس کی مولوی فتنہ طراز ہے
شیطان نے کی عرض، مرا کارنامہ ہے

☆☆

ہے آپ کو عوام کے سر کی قسم حضور
سینے میں دفن ہیں جو بہت راز کھولیے
ایوانِ اقتدار کے اندر کی داستاں
سب نہ بتایئے نہ سہی کچھ تو بولیے

☆☆

میٹرک فیل اور Ph.D کی ڈگری ہاتھ میں
دیکھیے گا ایسا بھی ایک حادثہ ہوجائے گا
اور اس دن ہوگا جس دن میرا کے جی مدرسہ
چارٹر مل جائے گا اور جامعہ ہوجائے گا

☆☆

تاریخ میں یہ موت بڑی شرمناک تھی
رستے میں ڈبل پول کا وہ دھوکا کھا گیا
کہتے ہیں ہیں شرم سے ہم اہلِ عاشقی
مجنوں بیچارا اونٹ کے پیروں میں آ گیا

☆☆

کیا بات ہے مولوی خٹک کی
پیٹتے ہیں مگر کھڑے ہیں تن کے
گو شجرہ نسب مختلف ہے
یہ بھائی ہیں مولوی مدن کے

☆☆

ڈالر کی قیمتوں میں اضافہ ضرور ہے
لیکن برآمدات کا انبار بھیجیے
گر مال بھیجنے کے لیے پاس کچھ نہ ہو
منڈی میں داغ حسرتِ دیدار بھیجیے

☆☆

عالمی منڈی کے ہیں پابند ہم
دیکھنا ہے اب کہاں جائیں گے لوگ
گر روپیہ کی ساکھ یوں گرتی رہی
حق مہر ڈالر میں بندھوائیں گے لوگ

☆☆

دیکھ تو اس کو ہلکا نہ جان
یہ بھی بڑا پتھر ہوتا ہے
جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے ہیں
لیکن باقی دھڑ ہوتا ہے

☆☆

اپنی ہی معذوریوں سے خوار ہیں
کس سے کہیں داستان بیش و کم
لے رہے ہیں اپنے سجدوں کا خراج
مسجدوں کی طاق میں رکھے صنم

☆☆

جانور سارے علم کا منبع
اک ویٹ نے یہ کی کمنٹری
ہاتھی کیا چیز ہے؟ علم الاجسام
اونٹ کیا چیز ہے؟ جیومیٹری

☆☆

مدت سے ہمیں گماں یہ تھا
ہم تاریخ سے جا لڑے ہیں
سچ یہ مورخوں کہ ہم لوگ
تاریخ کی راہ میں گر پڑے ہیں

☆☆

گر یہی رفتار سائنس کی رہی
آدمی پر وقت وہ آجائے گا
الٹراوائلٹ سے منہ دھو کر صبح
چائے میں لیزر بھگو کر کھائے گا

☆☆

یا کثرتِ جمہور کا دیجیے اسے نام
یا دیدۂ بینا کا تماشہ کہیے
سب مل کر اگر بکری کو کتّا کہہ دیں
بہتر ہے کہ پھر آپ بھی کتّا کہیے

☆......☆

شاعر بقلم خود

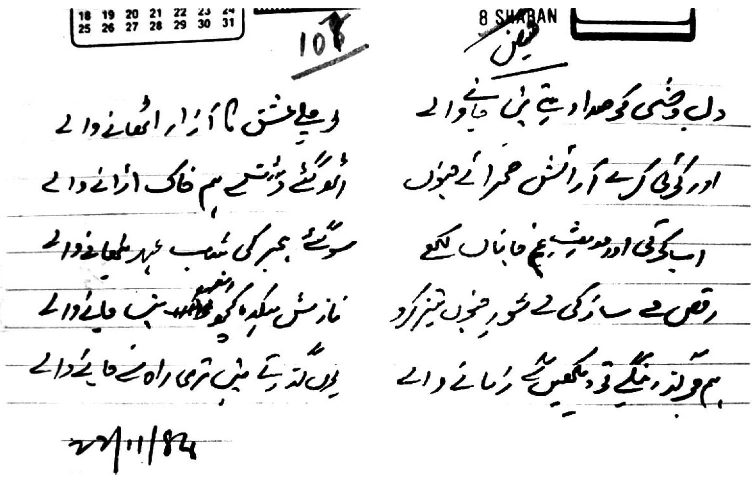

جھوٹ ایسا کہ جو سچ بھی نہ چھپانا چاہے
وہ خفا رہ کے مرا ساتھ نبھانا چاہے

دل وہ معصوم کہ جب جلے تو ایسے جلے
چھوڑ دے لعل و گہر آگ اٹھانا چاہے

اپنی پلکوں پہ مرے آنسو سجاتا تھا
آج وہ ترکِ تعلق کا بہانہ چاہے

مرغِ قفس تو جنگل کی فضا تکتی ہے
ان غزالوں کو جو چاہے تو دوانہ چاہے

مدت سے بچی ہے بس اک اصل جنوں
دل بیاباں کو چلا خاک اڑانا چاہے

خلعتِ مشک کو ہر قسم کی کدورت سے یہ دل
دھجیاں تیرے گریباں کی اڑانا چاہے

6/6/80.

۱۲۸

کچھ غمِ دل کا مداوا نہیں کرنے پائے
ہم نے چاہا تو بہت زخم نہ بھرنے پائے

رسمِ تعزیر کا انداز نیا ہے تیرا
زندہ رہ پائے نہ ہم شخص نہ مرنے پائے

اور بگڑا ہی چلا جاتا ہے کارِ دنیا
اسکے گیسو پریشاں نہ جو سنورنے پائے

تیرے ہاتھوں کی لکیر دل میں تو کچھ اور نہیں
اک رگِ جاں کا لہو ہے گر ابلنے پائے

روشنی چشمِ فسوں ساز کے احساں کی سی
کچھ شرارے جو مرے دل میں اترنے پائے

رضوی ہم اتنا حقائق کو لہو دے آئے
دیکھنا اب کے نہ ہم خواب بکھرنے پائے

۱۳ نومبر

ظلم کی شب کو ہم جو نمایاں کر گئے
ہم کہ حرفِ سخن تیغِ جاں کر گئے

ہر جرمِ عشق پیکر ہوئے کچھ تو
ذاتِ عشق کو داستاں کر گئے

قیدِ غم گشتہ اپنا بیتہ میں گئی
کنجِ زنداں کو ہم آسماں کر گئے

ساری سوکوں کو بے آب کر کے چلے
ہم دیے سکہ ہو اروال کر گئے

شہر میں جب سے ہم تن وفا ہوئے
شہر بھر کے لئے داستاں کر گئے

توڑ دیا گئے پھول مہکا گئے
ہم ہوا پر اک فن عیاں کر گئے

کون کہتا تھا اب قرضِ خاکِ وطن
ہم جدائی کو بارِ گراں کر گئے

جانفروشی کی زندہ روایت ہیں ہم
ایک جاں لے چلے کارواں کر گئے

13/11/84

ہم بیٹ فنیڈر کے جیالے ہیں
ہم لو اور دھوپ کے پالے ہیں
اس دھرتی کے رکھوالے ہیں
ہم سر کے بھوبر ڈالے ہیں

وادی کی سندرتا اپنی ہے
پربت کا مان ہمارا ہے
کھیتوں کی خوشبو اپنی ہے
اونچا کلیان ہمارا ہے

ہم دھرتی کے متوالے ہیں
ہم بیٹ فنیڈر کے جیالے ہیں

کیا ظلم و دہشت کے
کیا فحش تیس کی دلالی
کیا غنڈہ گردی بدمعاشی
کیا بدعملی کیا بدحالی

ہر ظلم سے لڑنے والے ہیں
ہم بیٹ فنیڈر کے جیالے ہیں

دار جنگ کے مطلق مرد تھا
ہم منچلوں راہ دکھاتا ہے
نوبہ سر قنسیں آواز قدم
طوفاں میں سب ڈھل جاتا ہے

ہم طوفانوں کے پالے ہیں
ہم بیٹ فنیڈر کے جیالے ہیں

ہم سندھو کے بیٹے بنسیاں ہیں
پنجاب کے جیالے سانولے ہیں
اس دیس کے کونے کونے سے
سب ہاتھ ہمارے پالے ہیں

سب مل کر لڑنے والے ہیں
ہم بیٹ فنیڈر کے جیالے ہیں

کھیتوں سے گونجتے گاؤں سے
گلیوں سے ہلوں کی راہوں سے
اسکولوں کی ٹھنڈی چھاؤں سے
آنچل سے مہکتی پائلوں سے

سب آگے بڑھنے والے ہیں
ہم بیٹ فنیڈر کے جیالے ہیں

سونا رستہ دور سویرا دیئے جلائے رکھنا
آج کی شب ہے بہت اندھیرا دیئے جلائے رکھنا
پل دو پل میں کس کو خبر ہے کیا سے کیا ہو جائے
چاروں جانب دشمنوں کا ڈیرا دیئے جلائے رکھنا
ذکرِ شب ہے راہزنوں کا ڈر ہے محافظ ڈھونڈ نہ لیں
میرا تیرا رین بسیرا دیئے جلائے رکھنا
تیرے ملن کی آس لئے دور نگر سے آئے ہیں
ٹوٹ نہ جائے راہی تیرا دیئے جلائے رکھنا
دل کے دریچے بند نہ کرنا روشن رکھنا پلکیں
زلفوں کا سایہ ہو گھنیرا دیئے جلائے رکھنا
نینوں والی آس نہ ٹوٹے تیری آنگن آنگن
جب تک نہ ہو چاند کا پھیرا دیئے جلائے رکھنا۔

19/12/77

دہلیز پہ یادوں کی اک جلتا دیا رکھنا
پلکوں کے [illegible] دریچوں پہ اک آس سجا رکھنا — دروازہ کھلا رکھنا

بھٹکے ہوئے جنگل سے وحشی کی صدا آئے
کیا جانیئے کب اسکی جانب سے ہوا آئے — دروازہ کھلا رکھنا

متوالوں کی مستی میں کب جانے خبر پھیلے
کب رنگِ حنا ابھرے باہوں کا سحر پھیلے — دروازہ کھلا رکھنا

تاریکی کے صحرا سے اس دل کی صدا ابھرے
اک آبلہ پا آئے اور نقشِ وفا ابھرے — دروازہ کھلا رکھنا

جب تک دل آوارہ ان راہوں پہ آ پہنچے
زندانوں کی بستی سے پیغام نیا پہنچے — دروازہ کھلا رکھنا

جب درد کی چوکھٹ پہ سجدے کو لئے آئیں
ایسا نہ ہو اے جانِ جاں دروازہ کو بند پائیں — دروازہ کھلا رکھنا
اک جلتا دیا رکھنا

30/10/80